قانونِ اسلامی۔ اختصاصی مطالعہ ۱

اصولِ فقہ

علم اصولِ فقہ

ایک تعارف

(حصہ اول)

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانونِ اسلامی۔اختصاصی مطالعہ

اصولِ فقہ۔۔۔۱

تعارفی مبحث۔۱

علم اصولِ فقہ

ایک تعارف۔ (حصہ اوّل)

ڈاکٹر محمود احمد غازی

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانون اسلامی۔ اختصاصی مطالعہ

اصول فقہ۔۔۔۔۱

تعارفی مبحث۔ ۱

عنوان	:	علم اصول فقہ، ایک تعارف (حصہ اول)
مؤلف	:	ڈاکٹر محمود احمد غازی
نظر ثانی	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ادارت	:	ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں
حتمی تصحیح	:	ڈاکٹر شہزاد اقبال شام۔ ڈاکٹر غلام یوسف
نگران منشورات	:	ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس	:	ڈاکٹر شہزاد اقبال شام
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
کمپوزر	:	خادم حسین
مطبع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی
سال طباعت	:	اول: ۲۰۰۲ء دوم: جون ۲۰۰۵ء سوم: اگست ۲۰۱۱ء
تعداد	:	۱۰۰۰ ۲۵۰۰ ۱۰۰۰

ISBN 969-8263-12-8

فہرست

۱۔	پیش لفظ	۵
۲۔	تعارف	۷
۳۔	اصول فقہ کیا ہے	۹
۴۔	علم فقہ	۱۴
۵۔	علم فقہ کے اہم شعبے	۱۶
۶۔	اصول فقہ کی فنی تعریف	۲۱
۷۔	اصول فقہ کی ضرورت: مقاصد اور غرض وغایت	۲۴
۸۔	اصول فقہ کا آغاز اور ابتدائی ارتقاء	۲۶
۹۔	عہد صحابہؓ میں اصولی مباحث	۳۰
۱۰۔	امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالہ"	۴۲
۱۱۔	اصول فقہ کے اسالیب ومناہج	۴۷
۱۲۔	اہم نکات	۶۲
۱۳۔	کتب برائے مزید مطالعہ	۶۳

پیش لفظ

کسی ریاست کا رائج قانون اس میں بسنے والوں کے اساسی نظریات و عقائد کا عکاس ہوتا ہے ورنہ قانون اور قوم میں اجنبیت کے باعث نہ تو قانون اس قوم میں قبولیت عام کی سند حاصل کرتا ہے اور نہ قوم اس قانون کے احترام اور پاسداری میں گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی اشتات و انتشار اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر قانون اجنبی اور مسلط کردہ ہو تو اس پر عمل جبر کے تحت ہوتا ہے اور مجبور قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ اجنبی قانون تو وہ قومیں اپناتی ہیں جو خود کسی دستور اور نظم قانون سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

مسلم امہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دستور سازی اور قانون سازی پر اس کا علمی ورثہ بہت گراں قدر ہے۔ گذشتہ ۱۳ صدیوں سے مسلمان اہل علم کی تحریریں قانون اور اصول قانون پر دنیا بھر کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ امام مالکؒ (م۱۷۹ھ)، امام محمد شیبانیؒ (م۱۸۹ھ) اور امام شافعیؒ (م۲۰۴ھ) کی کتابیں آج بھی روشنی کا منبع ہیں۔

امت مسلمہ کے قانونی اور دستوری نظام کے دو بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر اسلام کا قانونی نظام نہ تو اپنی صحیح شکل و صورت میں قائم رہتا ہے اور نہ ان سے فکری غذا حاصل کیے بغیر ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ پہلا بنیادی عنصر اسلامی عقائد ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان میں فکری استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ فکری استحکام ایمان و یقین کی وجہ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ صاحب ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق و صداقت کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ دوسرا بنیادی عنصر اخلاق و تزکیہ ہے۔ مکارم اخلاق کی تعلیم اور تزکیہ نفس انسان کے کردار، مزاج اور رویہ کی اصلاح کر کے اسے معاشرہ میں تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ مقام پر فائز رکھتے ہیں۔

امت مسلمہ جب تک اپنے فقہی اور قانونی ورثہ سے وابستہ رہی اس وقت تک اس کی ترقی کی رفتار بھی تیز رہی اور عالمی قیادت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہترین نمونہ بھی پیش کرتی رہی۔

لیکن جب مسلمانوں میں بنیادی عقائد کی تعلیم و تربیت کا نظام کمزور پڑ گیا اور اخلاقی اقدار میں ضعف پیدا ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور قانونی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ پھر استعماری دور میں اسلامی روایات، نظام تعلیم، قانون اور تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لیے منظم کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں برصغیر میں ملک کے اسلامی عدالتی اور تعلیمی نظام کی جگہ استعمار کے اپنے نظام نے لے لی۔ اس صورت حال نے اس پورے خطہ کو بری طرح متاثر کیا اور بتدریج ہر شعبہ زندگی میں شر و فساد سرایت کرتا چلا گیا جس کے تباہ کن اثرات سے آج ہم دوچار ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے برحق فرمایا تھا:

نَحْنُ قَوْمٌ أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ، وَإِنِ ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ أَذَلَّنَا اللّٰهُ

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی، اگر ہم نے عزت کو اسلام کے علاوہ کسی اور نظام حیات میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کردے گا۔

لیکن آج مسلمانوں میں موجودہ صورت حال کو تبدیل کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ غیر اقوام کے قانون سے خود کو آزاد

کرا کے قرآن و سنت کے نظام حیات میں دوبارہ عزت تلاش کریں۔ اسی تڑپ کے وہ مظاہر ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں عالم اسلام اور عالم کفر کے مابین کشمکش کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

امت مسلمہ کو ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جن کی جدید قانونی نظریات پر تنقیدی نظر ہو اور جو فقہ اسلامی کے اصل مآخذ سے استفادہ کرنے کی دسترس رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا احکام شریعت کی اکملیت، حقانیت اور ان کے قابل عمل ہونے پر غیر متزلزل ایمان اور ان احکام کو روبہ عمل دیکھنے کی حقیقی تمنا اور لگن بھی ہو۔

ایسے رجال کار کی تیاری میں شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اپنے قیام کے روز اول سے مصروف عمل ہے۔ اس کام میں بیرون ملک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی قانون دان طبقوں کے تربیتی پروگراموں کا انعقاد مسلسل جاری ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبہ میں فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر "سلسلہ مباحث فقہیہ" کی تیاری اور اردو اور انگریزی زبانوں میں تراجم کا کام بھی ہو رہا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کے تحت "مطالعہ اسلامی قانون" پر ایک ابتدائی کورس کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس ایک سالہ فاصلاتی کورس کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک ہزاروں افراد اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکے اور کر رہے ہیں۔

ہم نے اس ابتدائی کورس کے آغاز پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر "ایڈوانس کورسز" تیار کیے جا رہے ہیں اور جلد ہی ان کو شروع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمارے عزم کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشا، ہماری راہیں آسان فرمائیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ اصول فقہ (ISLAMIC JURISPRUDENCE) میں اختصاصی مطالعہ (ADVANCE COURSE) کا اجراء کر سکیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یہ اختصاصی مطالعہ چوبیس درسی اکائیوں (UNITS) پر مشتمل اور ایک سالہ دورانیہ کا ہے۔

اسلامی قانون میں دیگر اختصاصی مطالعہ جات کی تیاری کا کام جاری ہے ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اس نے جس طرح ہمیں اصول فقہ میں اس اختصاصی مطالعہ کو شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اسی طرح ہمارے دیگر منصوبوں کی تکمیل میں بھی فضل الٰہی شامل حال رہے گا۔ إن شاء اللہ

پاکستان بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر قانون الٰہی کے غلبہ و قیادت کے لیے مطلوبہ رجال کار کی تیاری کسی ایک ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں امت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اہل علم سے ایسی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے منصوبوں کی بہتری میں ممد و معاون ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تعارف

''قانون اسلامی۔ اختصاصی مطالعہ'' کے ضمن میں اصول فقہ پر فاصلاتی کورس کے آغاز پر یہ پہلی درسی اکائی(UNIT) ''علم اصول فقہ:ایک تعارف۔ا'' پر مشتمل ہے، جس میں علم اصول فقہ کی تعریف، اس کے اہم شعبے، اس علم کے مقاصد اور غرض وغایت، آغاز و ابتدائی ارتقاءاور اس کے اسالیب ومناہج جیسی اہم بحثیں سمیٹی گئی ہیں۔

اس درسی اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ جس علم کا مطالعہ شروع کرنے والے ہیں اس کی بنیادی معلومات اس انداز سے پیش کردی جائیں کہ اس کی اہمیت وافادیت اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اس درسی اکائی کے مطالعہ سے علم اصول فقہ کے بارے میں نہ صرف آپ کی معلومات اور اپنے اس ملی قانونی علمی سرمایہ پر آپ کے اعتماد میں اضافہ ہوگا بلکہ اپنے آباء واجداد کے اس عظیم فکری وعلمی خزانہ پر آپ تفاخر کا اظہار بھی کرسکیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم اصولِ فقہ

اصولِ فقہ کیا ہے

اصول فقہ سے مراد اسلامی شریعت کے وہ بنیادی اصول اور فقہ اسلامی کے وہ قانونی قواعد وضوابط ہیں جن سے کام لے کر ایک ماہر فقیہ اور قانون دان شریعت کے مصادر و ماخذ سے تفصیلی احکام کا استنباط کرتا ہے۔ جیسا کہ ہر مسلمان جانتا ہے، شریعت کے مصادر و مآخذ میں اصل اور بنیادی مآخذ دو ہی ہیں، یعنی قرآن مجید اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ان دونوں کی سند (AUTHORITY) کی بنیاد پر بقیہ مآخذ (جن میں اجماع اور اجتہاد و قیاس کو بڑی اہمت حاصل ہے) اپنے اپنے درجہ پر آتے ہیں۔ لیکن ان سب مصادر و مآخذ سے تفصیلی احکام کو اخذ کرنا اور ان کو مرتب و منضبط کرنا نہ صرف گہری قانونی بصیرت اور عمیق فقہی نظر کا متقاضی ہے بلکہ اس عمل کو انجام دینے کے لیے کچھ طے شدہ امور، مرتب اصول اور منضبط قواعد و احکام بھی ہیں جن کو اس پورے عمل میں سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ انہی قواعد و احکام کے مجموعہ کا نام اصول فقہ ہے۔

اس مختصر وضاحت سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسلامی علوم میں اصول فقہ کی کیا اہمیت ہے۔ اصول فقہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر علامہ ابن خلدونؒ (م ۸۰۸ھ) نے اس کو علوم شرعیہ میں سب سے اعلیٰ، سب سے برتر اور سب سے زیادہ مفید قرار دیا ہے۔ دیگر مورخین و مفکرین اسلام نے بھی علم اصول فقہ کو علوم اسلامیہ کا گل سرسبد، اسلامی علوم کی ملکہ، فکر اسلامی میں جدت اور طباعی کا سب سے بڑا مظہر اور مسلمانوں میں فکری منہاج کا سب سے نمایاں نمونہ قرار دیا ہے۔ بعض جدید مصنفین نے اس کو فلسفہ قانون اسلامی، منہاجیاتِ قانون (JURIDICAL METHODOLOGY) اور علم تقنین (LEGISLATION SCIENCE) کی وضاحتی اصطلاحات سے بھی تعبیر کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علم اصول فقہ نہ صرف اسلامی علوم کی تاریخ میں، بلکہ دنیائے قانون کی عالمی تاریخ میں اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کاوش ہے۔ اسلام سے قبل کی تہذیبوں (مثلاً یونانی، ہندوستانی، رومی، عراقی، مصری، چینی وغیرہ) میں قانون کے جزوی احکام کے مجموعوں اور فروعی تفصیلات کے نمونے تو بہت ملتے ہیں، لیکن اصول قانون یا فلسفہ قانون کا ایک الگ فن کے طور پر کوئی تصور نہیں ملتا۔ بلاشبہ افلاطون کے مکالمات، بالخصوص ''جمہوریہ'' میں اور ارسطو کی تصانیف، بالخصوص ''سیاسیات'' اور ''قوانین'' میں قانون کی سند اور اتھارٹی کے بارہ میں

بعض دقیع خیالات ملتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے مباحث کے ضمن میں ملتے ہیں جہاں فلسفہ' سیاسیات اور اخلاقیات کی حدود میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ افلاطون اور ارسطو کی متعلقہ تحریروں میں فلسفہ' سیاسیات اور اخلاقیات کے مباحث اس طرح ملے جلے اور مخلوط ہیں کہ ان کو الگ الگ منقح کر کے بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔ پھر ان مباحث میں اگر کوئی بات اصول قانون کے طلبہ کی دلچسپی کی ملتی بھی ہے تو یا تو وہ محض کہیں ضمنا" آگئی ہے یا دوسرے علوم کے حوالہ سے آئی ہے۔ غالبا" یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کی موجودگی کے باوجود آج تک کسی نے افلاطون کی "جمہوریہ" یا ارسطو کی "سیاسیات" کو اصول قانون کی کتاب قرار نہیں دیا۔ رہی دوسری اقوام اور تہذیبیں (مثلاً یہودی' ہندو' بابلی' رومی) جن کے ہاں قوانین کے تحریری اور غیر تحریری مجموعے قدیم سے چلے آتے ہیں تو ان کے ہاں تو اصول قانون سے متعلق وہ ابتدائی تصورات بھی بہت کمیاب ہیں جو یونانیوں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں تقریبا" آغاز ہی سے اصول قانون کے نام سے ایک الگ اور منفرد شعبہ علم کا تصور موجود ہے۔ مسلمانوں نے پہلی بار دنیا کو اصول قانون کا علم عطا کیا اور دنیائے قانون کی ایک ایسی کمی کو پورا کیا جس کا شاید احساس تو عرصہ سے موجود تھا لیکن کسی قوم نے اس احساس کو عملی جامہ نہ پہنایا تھا۔ مسلمان قانون دانوں نے دوسری صدی ہجری کے اوائل سے ہی اس ضرورت کا احساس کیا اور قانون کی بنیاد' اس کی اساس' اس کی سند اور اتھارٹی' اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر غور و فکر کا آغاز کر دیا۔ عصر حاضر کے نامور محقق اور قانون دان ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا خیال ہے کہ اصول فقہ اور فروع فقہ کی اصطلاحات قرآن پاک کی اس آیت سے ماخوذ ہیں:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ

(ابراہیم ۱۴:۲۴)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی (اچھی) تمثیل کلمہ طیبہ کی بیان فرمائی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب مضبوط ہے اور اس کی شاخیں بہت اونچائی میں جا رہی ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں کلمہ طیبہ کی جڑوں کو اصول اور شاخوں کو فروع کہا گیا ہے جس سے اس بات کا صاف اشارہ ملتا ہے کہ کلمہ طیبہ (شریعت الٰہی) کے کلیات کو اصول اور جزئیات کو فروع کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

اصول فقہ' دین اور شریعت کے ایک ابتدائی تعارف کے لئے ضروری ہے کہ پہلے دین و شریعت کی اس عمومی اسکیم کو سامنے رکھا جائے جس کا ایک اہم حصہ اصول فقہ ہے اور پھر فقہ اور اصول فقہ کے فنی فرق کو بیان کرتے ہوئے اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف کی جائے

ہمہ گیر - Muti dimensional
متناسق = Coherent
مربوط - organized
متکامل - complementry

دین

قرآن مجید اور سنّت کی تعلیم پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ہمہ گیر اور جامع تعلیم انسانی زندگی کے ہر پہلو میں راہنمائی فراہم کرنے کی ایک مکمل اسکیم پیش کرتی ہے۔ اسلام کی یہ مکمل اور ہمہ گیر اسکیم باہم مربوط، متناسق، متکامل اور متناسب ہے۔ اس کے جملہ ابواب و اجزاء ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے

پر عملدر آمد میں سہولت اور آسانی بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان اجزاء میں انسانی زندگی کے تمام نازک پہلوؤں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ اس تعلیم میں بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کی جزوی اصلاح کے بجائے کلی اور ہمہ پہلو اصلاح کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس کلی اور ہمہ پہلو صلاح و فلاح کے لئے ایک کلی اور ہمہ گیر نظریہ حیات اور تصور کائنات کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان کے پیش نظر زندگی اور کائنات کے بارہ میں ایک مکمل، جامع، ہمہ گیر اور مربوط فلسفہ زندگی اور تصور کائنات نہیں ہو گا اس وقت تک ان سب پہلوؤں میں اس کی اصلاح کا کوئی دیرپا، جامع اور قابل عمل نظام مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس مکمل، جامع، مربوط اور ہمہ گیر تصور حیات کو قرآن کی زبان میں دین کی جامع اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ دین کا ترجمہ بعض لوگ مذہب یا ریلیجن سے کرتے ہیں جو اس کی ہمہ گیری کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ لیکن اس کا صحیح مناسب اور مکمل اردو متبادل کیا ہونا چاہئے، اس بارے میں مختلف اہل علم نے مختلف اصطلاحات تجویز کی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ نظام حیات، نظام زندگی اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ اور رویہ ہی دراصل دین کا اصل مفہوم ہے جس میں زندگی کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

قرآن پاک کی نظر میں دین (یعنی زندگی کا عمومی رویہ اور نظام حیات) دو ہی ہیں: ایک دین حق، یعنی وہ طرز عمل اور رویہ جو اللہ کی مرضی اور منشاء کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مبنی ہو، دوسرا دین باطل، یعنی وہ طرز عمل اور رویہ جو اللہ کی مرضی اور منشاء سے انحراف پر مبنی ہو۔ اللہ کی نظر میں زندگی کا پہلا رویہ ہی قابل قبول ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران ۳:۱۹)

یعنی اللہ کے نزدیک دین وہی ہے جو اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے سے عبارت ہو۔ اس طرز عمل کے علاوہ اگر کوئی طرز عمل انسان اختیار کرے گا تو اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول نہ ہو گا۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

(آل عمران ۳:۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ

شخص آخرت میں تباہ کاروں میں شمار ہو گا۔

غالباً" یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ادیان کا لفظ صیغہ جمع میں کہیں نہیں آیا۔ شاید اس لئے کہ دین کی کوئی تیسری قسم واقعتہ" موجود ہی نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی سے انحراف کی بہت سی صورتیں اور محرکات و عوامل ہو سکتے ہیں لیکن انحراف ہونے کی حیثیت سے وہ سب صورتیں ایک ہی زمرہ میں شمار ہوں گی۔

قرآن پاک سے پتا چلتا ہے کہ دین حق (یعنی اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کردینے کا رویہ) ابتدائے آفرینش سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے اور اس کو ہر دور میں اسلام سے ہی یاد کیا گیا اور اس کے علم بردار انسانوں کو مسلم اور مسلمین کی اصطلاحات سے جانا گیا۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے اسی ایک دین کی دعوت دی جس کی بنیادیں توحید' رسالت اور آخرت کے سہ گانہ اصولوں پر قائم تھیں۔ دین کا بنیادی مقصد ہر دور میں ایک ہی رہا' یعنی انبیاء کی لائی ہوئی شریعت پر عملدرآمد اور مکارم اخلاق کا اختیار کرنا۔ مختلف انبیاء نے اپنے اپنے مخاطبین کی ذہنی اور ثقافتی سطح کے مطابق ان اصولوں کی تعلیم دی۔ جب انسانیت عہد طفولیت کے مرحلہ سے گذر رہی تھی تو اس وقت کے انبیاء نے انتہائی سادہ اور ابتدائی اصولوں تک اپنی تعلیم و تبلیغ کو محدود رکھا۔ جوں جوں انسانیت ارتقاء کے مراحل طے کرتی گئی انبیاء کی تعلیم میں بھی وسعت اور گہرائی آتی چلی گئی۔ یہی حال مختلف انبیاء کی لائی ہوئی شریعتوں کا بھی رہا۔ جن اقوام میں ڈسپلن اور نظم و ضبط کی کمی تھی ان کو سخت احکام دیے گئے۔ جن قوموں نے قانون پسندی کا مطلب ظاہر پرستی اور حرفیت پسندی قرار دیا ان کو ایسے احکام دیے گئے جن کے ذریعہ قانون کی اصل روح کو اجاگر کیا جا سکے۔

شریعت

دین کے اصولوں پر عملدرآمد اور انسانی زندگی میں ان اصولوں کی عملی تشکیل کا واحد راستہ جو اللہ اور اس کے رسول نے بتایا اور دکھایا شریعت کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن پاک میں بھی مختلف صیغوں (شریعت' شرعہ' شرع) میں استعمال ہوئی ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی بار بار آئی ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ لغوی اعتبار سے شرع سے مراد پانی کے کسی ذخیرہ سے براہ راست چلو بھر کر یا کسی اور ذریعہ سے پانی حاصل کرنا ہے۔ اسی سے شریعت کا لفظ بھی ماخوذ ہے۔ شریعت سے مراد وہ کشادہ' سیدھا' واضح اور صاف راستہ ہے جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ایسے ذخیرہ اور ماخذ تک پہنچا دے جہاں سے ہر شخص آسانی سے پانی پی سکے۔ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے بھی شریعت ان اوصاف سے مزین ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اس واضح راستہ یعنی شریعت کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جو راستہ لے کر آیا ہوں وہ یکسوئی کے ساتھ منزل مقصود تک لے جانے والا' نرمی اور آسانی

لفظ حنیف قرآن کریم میں ان سورتوں/آیات میں استعمال ہوا ہے۔ البقرۃ ۲-۱۳۵ ء النحل ایضاً ۱۲۰ء اعراف ۱۵۷
حج ۸۔ ۷۸ ، البقرۃ - ۱۳۵

پیدا کرنے والا، سہولت بخش، روشن اور اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح چمکدار ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، احب الدین الی اللہ الحنیفیۃ السمحۃ

انی ارسلت بحنیفیۃ سمحۃ(۱)

The Holy Prophet (SAW) God had great liking for a religion that is straight-forward and easy to follow (Bukhari, Chapter 29) Narrated by Abu Hurairah (RA)

بے شک مجھے سیدھا منزل کی طرف لے جانے والا اور نرمی والا دین دے کر بھیجا گیا ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

★ قدترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها(۲)

میں نے تم کو ایسی شریعت پر چھوڑا ہے جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے۔

یہ سب وہی خصوصیات ہیں جو شریعہ کے لغوی مفہوم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس راستہ پر کامیاب سفر کر کے ہی انسان دنیا اور آخرت میں سرخ رو ہو سکتا ہے۔

کامیابی کے اس راستہ پر سفر کی کئی سطحیں ہیں۔ ایک سطح عقائد، ذہنی تصورات، فکری کاوشوں اور عقلی نظریات کی سطح ہے۔ یہ شریعت کا وہ حصہ ہے جس سے علم کلام یا علم عقائد میں بحث ہوتی ہے۔ اس شعبہ علم کو آج کل بعض عرب مولفین علم توحید کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ شریعت کا یہ حصہ انسانی زندگی کے ان بنیادی سوالات سے بحث کرتا ہے جن پر انسان کی پوری زندگی کا دارومدار ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کیا ہے، وہ کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، کیسے آیا ہے، اس کے آنے کا مقصد کیا ہے، اس کے آنے کے مقصد کا تعین کون اور کیسے کرے گا، انسان کی اس زندگی کی حقیقت کیا ہے، اس زندگی کے بعد اسے کہاں جانا ہے اور کس طرح جانا ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے سوالات انسان کی کامیاب زندگی کے لئے بڑی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب تک ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب انسان کے پاس موجود نہ ہو وہ اپنی زندگی کا کوئی نظام مرتب نہیں کر سکتا۔ دنیا کے ہر قانون، فلسفہ، نظریہ اور تہذیب و ثقافت کی پشت پر ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور موجود ہوتا ہے جس سے اس کا نظریہ کائنات وجود میں آتا ہے۔

Hanif: "Inclined towards truth"
Samha: "Easy" or "facile to perform"

۱۔ مسند احمد بن حنبل، دار الفکر ۶/۲۳۳

۲۔ مسند احمد بن حنبل، دار الفکر ۴/۱۲۶۔ مزید دیکھیں سنن ابو داود، المقدمۃ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

★ بعثت بالملۃ الحنیفیۃ البیضاء لیلها ونهارها سواء

I have been sent (as messenger) of the millat of (Abraham). It is a religion so resplendent that for it the day and night are equal.

عقائد کے بعد دوسری سطح انسان کے قلبی احساسات اور جذبات و عواطف کی ہے۔ شریعت کی تعلیم کا وہ حصہ جو ان امور کو منضبط کرتا ہے تزکیہ یا احسان کہلاتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے اس پہلو کو بڑی اہمیت دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے جب تک انسان کے قلبی احساسات درست اور مثبت رہتے ہیں انسان کی پوری زندگی درست اور مثبت رہتی ہے مگر جوں ہی قلبی احساسات بگڑتے اور منفی رخ اختیار کرتے ہیں انسان کی پوری زندگی بگڑ کر منفی راستہ پر چل پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے جذباتی استحکام اور قلب کی راست روی پر بڑا زور دیا ہے اور اپنی تعلیم کا ایک اہم حصہ اس کے لئے وقف کیا ہے۔ لیکن جذباتی استحکام اور قلبی راست روی آسان کام نہیں ہے۔ زندگی میں ہزاروں منفی قوتیں اور لاکھوں ترغیبات ایسی موجود ہیں جن سے دامن بچا کر کامیابی سے نکل جانا بڑی پختہ تربیت اور مستحکم ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ پختہ تربیت اور مستحکم ایمان اللہ کی بارگاہ میں دائمی حضوری کے احساس و ایقان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ حضوری کا یہی احساس و ایقان ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں، جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے، احسان سے تعبیر فرمایا ہے (۳)۔

تزکیہ واحسان کے بعد تیسری سطح انسان کی ظاہری اور عملی زندگی کی ہے۔ شریعت کا وہ حصہ جو انسان کے ظاہری اعمال وافعال کو منضبط کرتا ہے فقہ کہلاتا ہے۔ انسان کے جسمانی افعال واعمال اور اعضاء و جوارح کی سرگرمیاں لامتناہی ہیں۔ وہ رات کو بستر پر آرام کرنے سے لے کر بین الاقوامی سطح پر سفارتی سرگرمیوں تک لاکھوں قسم کے مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ ان سب اعمال و مشاغل کو اخلاقی قواعد و ضوابط اور الٰہی تعلیمات کے تحت منضبط کرنا شریعت کی تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے اہم حصہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ شریعت کی تعلیم کے مذکورہ بالا دونوں پہلو ایک اعتبار سے اسی تیسرے پہلو کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کو اس کے لئے تیار کرتے ہیں۔ شریعت کا یہ حصہ اصطلاحی اعتبار سے فقہ کہلاتا ہے۔ چونکہ شریعت کی تعلیم کا یہ حصہ اپنے موضوع کی کثرت اور تنوع کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے اس لئے بعض اوقات شریعت کی اصطلاح کا اطلاق شریعت کے اس اہم جزو پر بھی کر دیا جاتا ہے اور شریعت کے اس ایک جزو کو ہی شریعت کہہ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے فقہ اور شریعت کی اصطلاحات کبھی کبھی مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔

علم فقہ

فقہ کے لفظی معنی کسی چیز کی گہری فہم اور سمجھ بوجھ کے ہیں۔ بظاہر فقہ کے لفظی معنی اور انسان کے ظاہری اعمال کو منضبط کرنے

۳۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ وبیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ

والے مجموعہ ہدایات کے درمیان کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی، لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جتنے اعمال بھی کرتا ہے وہ لامتناہی ہیں۔ ایک دکاندار کو دکان داری اور تجارت کے دوران بے شمار قسم کے اعمال اور سرگرمیاں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ ایک شخص کھانا کھانے ہی کے دوران بیسیوں قسم کے عمل کرتا ہے۔ ملازمت کرنے والے کو ملازمت کے سلسلہ میں ہزاروں اعمال و افعال سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان اعمال کی نہ کوئی انتہاء ہے اور نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اربوں اور کھربوں سے بھی شاید ان کی تعداد متجاوز ہی ہو گی۔ ان کے مقابلہ میں شریعت کی وہ ہدایات (نصوص) جو ان کھربوں اعمال کو منضبط کرتی ہیں وہ بہت ہی محدود ہیں۔ قرآن پاک کی چھ ہزار چند سو آیات میں سے بمشکل چند سو وہ ہیں جو براہ راست فقہی ہدایات پر مشتمل ہیں جن کو آیات احکام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چالیس پچاس ہزار احادیث کے ذخیرہ میں وہ احادیث جو براہ راست عملی ہدایات پر مشتمل ہیں اور جن کو احادیث احکام کہا جاتا ہے اڑھائی تین ہزار سے متجاوز نہیں ہیں۔ گویا یہ تین ہزار چند سو نصوص اربوں انسانوں کے کھربوں اعمال کو منظّم و منضبط کرتی ہیں۔

ان چند ہزار نصوص کی روشنی میں انسانی افعال و اعمال کو منظّم و مرتب اور منضبط کرنے کا یہ اہم ترین عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان نصوص پر گہرا غور و فکر نہ کیا جائے اور گہری بصیرت اور عمیق فہم سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے عمیق فہم اور گہری بصیرت اس پورے عمل کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر شریعت کی تعلیم کے اس حصہ پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قرآن پاک میں بلکہ احادیث نبوی اور اسلامی ادبیات کے پورے ذخیرہ میں فقہ کا لفظ اسی بصیرت افروز، بصیرت آمیز اور مبنی بر بصیرت تعلیم کے لئے استعمال ہوا ہے جس کی گہرائی اور گیرائی کی مثال انسانی فکر و علوم کی تاریخ میں ناپید ہے۔ فقہ کے ارتقاء اور تشکیل میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے اور اس مجموعہ علوم کو بجا طور پر اسلامی علوم و ثقافت اور تہذیب و افکار کا گل سرسبد قرار دیا جانا چاہئے۔

فقہائے کرام نے فقہ کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ ان تعریفات میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ یہ شریعت کے احکام کا وہ حصہ ہے جو انسان کے اعمال (بمقابلہ افکار و احساسات) سے بحث کرتا ہے۔ عام طور پر فقہائے کرام کے ہاں جو تعریف مقبول و معروف ہے وہ ہے:

العلم بالاحکام الشرعیۃ العملیۃ عن ادلتھا التفصیلیۃ

یعنی فقہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے۔ معاصر عراقی فقیہ استاذ

آیات احکام اور احادیث احکام

عبدالکریم زیدان کی رائے میں فقہ کی یہ تعریف سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہے۔

انسان کی عملی زندگی اور اس کے ظاہری اقوال و افعال کو منظم و منضبط کرنے والے علم کی حیثیت سے فقہ کا دائرہ کار قریب قریب پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک اس سے جو بھی اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں علم فقہ ان سے بحث کرتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فقہ کے احکام کا اطلاق انسان کی ذات پر اس کی پیدائش سے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد تک جاری رہتا ہے۔ اس پوری مدت میں انسان کا کوئی قول یا فعل ایسا نہیں جس کے بارہ میں فقہ کا کوئی مثبت یا منفی موقف نہ ہو اور جس کے بارہ میں فقہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔

علم فقہ کے اہم شعبے

انسانی زندگی پر محیط یہ جامع، مربوط، مکمل اور متکامل ہدایت نامہ فقہ اسلامی کے وسیع و عمیق اور بے مثال ذخیرہ سے عبارت ہے۔ فقہائے اسلام نے اس کی تدوین و تشکیل کے روز اول ہی سے اس کی دو بنیادی قسمیں قرار دے دی تھیں۔ ایک اصول فقہ اور دوسری فروع فقہ۔ پہلی سے مراد وہ بنیادی اصول و قواعد ہیں جن کی مدد سے فقہ کے تفصیلی احکام (فروع) معلوم کئے جا سکیں۔ اگر علم فقہ کو ایک سدا بہار درخت سے تشبیہ دی جائے تو اصول سے مراد اس کی جڑیں اور تنا ہے اور فروع سے مراد اس کی شاخیں اور ثمرات ہیں۔ اصول ذریعہ اور ماخذ ہیں اور فروع اصل ہدف اور مقصود ہیں۔ فروع سے مراد احکام و قوانین کا وہ ذخیرہ ہے جس پر عملدر آمد مطلوب ہے۔ فروع فقہ اسلامی قانون کا Corpus juris ہیں اور اصول فقہ سے مراد اسلام کا جورس پروڈنس ہے۔ اصول کے مقابلہ میں فروع کی وسعت اور پھیلاؤ بہت زیادہ ہے، جبکہ فروع کے مقابلہ میں اصول اپنی گہرائی اور تعمق میں ممتاز ہیں۔ پہلے ہم فروع کے بنیادی مضامین و ابواب کو بیان کرتے ہیں:

فقہائے کرام نے تعلیم و تفہیم کی سہولت کی خاطر فقہ کے مضامین و مندرجات کو متعدد انداز سے تقسیم کیا ہے۔ بعض حضرات اس کی تقسیم عبادات اور عادات کے دو عمومی موضوعات کے تحت کرتے ہیں۔ یعنی وہ احکام جن کا مقصد اللہ اور بندہ کے درمیان تعلق کو مضبوط بنانا ہے اور وہ احکام جو بندوں کے مابین تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ بعض دیگر حضرات نے عبادات، عادات اور معاملات کی سہ گانہ تقسیم کو زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔ تاہم دور جدید کے فقہائے اسلام کا رجحان زیادہ تفصیلی تقسیم کا ہے۔ وہ فقہ کے موضوعات و مضامین کو جدید مغربی قانون کی اصطلاحات میں بیان کرنا موزوں سمجھتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ قانون دان حضرات اور جج صاحبان کی سہولت تفہیم ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ اگرچہ یہ تقسیمیں نئی ہیں، لیکن یہ مضامین اور ان کی قدیم اصطلاحات اتنی ہی قدیم ہیں جتنا خود فقہ اسلامی قدیم ہے۔

اصول و فروع

عبادات، عادات
عبادات، عادات اور معاملات

پہلی صدی ہجری کے اواخر سے فقہی مضامین کو پیش کرنے کی جو ترتیب اختیار کی گئی تھی وہ کم وبیش آج تک چلی آرہی ہے اور بہت کم فقہی کتابیں ایسی ملیں گی جن میں اس ترتیب سے نمایاں طور پر انحراف کیا گیا ہو۔ اگر کوئی فرق کہیں نظر آتا ہے تو وہ عام طور پر جزوی قسم کا ہی ہے بنیادی اور جوہری قسم کا نہیں ہے۔ اس ترتیب کے لحاظ سے فقہ کی کتابوں کے مندرجات کو درج ذیل بڑے بڑے عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ عبادات

یہ فقہ اسلامی کا اولین موضوع ہے جس سے فقہ کی ہر کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جزو میں طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج وغیرہ کے احکام سے بحث ہوتی ہے۔

۲۔ فقہ الأسرۃ Family Laws

یہ فقہ اسلامی کا وہ حصہ ہے جو انسان کی عائلی زندگی کو منظم و منضبط کرتا ہے۔ فقہ الاسرہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک کی آیات احکام کا (جن کی تعداد کا اندازہ ۲۵۰-۳۰۰ کے درمیان ہے) کم وبیش ایک تہائی یا اس سے کچھ زائد صرف شخصی اور عائلی قوانین سے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشرت و قانون میں ادارہ خاندان کو بڑی بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس مرکزیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ خاندان اور نسل کے تحفظ کو اسلام کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ ادارہ خاندان کی یہ اہمیت اس لئے ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور امت کی تکوین میں سب سے بنیادی اکائی خاندان ہی ہے۔ اگر خاندان کی اکائی مضبوط اور اسلامی اساس پر قائم ہے تو وہاں سے جو افراد تیار ہوں گے وہ بنیادی دینی تربیت کے حامل ہوں گے اور ایسے خاندانوں سے جو معاشرہ بنے گا وہ اسلامی اساس سے قریب تر ہوگا۔

فقہ الأسرۃ یا عائلی قوانین میں نکاح، طلاق، وراثت، وصیت، نفقہ اور حضانت (بچہ کی نگہداشت اور پرورش کا حق) کے ابواب سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی ادارۂ خاندان وجود میں کیسے آئے گا، افرادِ خاندان کے حقوق اور فرائض کیا کیا ہوں گے، اگر وجود میں آنے کے بعد خاندان میں اختلافات جنم لینے لگیں تو ان کو کیسے دور کیا جائے گا۔ مرنے والے کی جائیداد افرادِ خاندان میں کیسے اور کس تناسب سے تقسیم کی جائے اور افرادِ خاندان کی ضروریات کی تکمیل اور مفادات کی نگہداشت کیسے کی جائے گی۔

۳۔ معاملات

منطقی اور واقعاتی ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو گھریلو زندگی کے بعد انسان کی معاشرتی زندگی آتی ہے جس میں اس کو لوگوں سے لین دین، خرید و فروخت اور مال و دولت سے متعلق معاملات طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ معاملات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو وہ جن میں فریقین کے قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے ہوں اور کچھ وہ جن کے نتیجہ میں ایسے قانونی حقوق و فرائض مرتب نہ ہوتے ہوں جن کو عدالتوں کے ذریعہ نافذ کرایا جا سکتا ہو۔ ان میں سے پہلی قسم کا اصطلاحی نام فقہ المعاملات ہے۔ یہ فقہ اسلامی کا سب سے وسیع اور سب سے عمیق میدان ہے۔ عام طور پر آج کل کے جدید فقہاء اس کو اسلام کا دیوانی قانون قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوانی قانون یا سول لاء کے نام سے یورپ میں بالعموم اور فرانس میں بالخصوص قانون کے جس شعبہ کو یاد کیا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ فقہائے اسلام کی تقسیم کی رو سے معاملات ہی کے ابواب میں زیر بحث آتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فقہ المعاملات کا دائرہ جتنا وسیع ہے اس کے لحاظ سے اس کو دیوانی قانون کا مترادف قرار دینا اس کی وسعت کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا فقہ المعاملات کو دیوانی قانون کا مترادف قرار دے کر اس کی وسعت کو سول لاء کی تنگنائیوں میں محدود کر دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

فقہ المعاملات میں وہ تمام احکام بھی شامل ہیں جن کا تعلق افراد یا گروہوں کے درمیان لین دین اور تجارتی قسم کے تعلقات سے ہے۔

۴۔ فقہ التعامل الاجتماعی

معاشرتی سطح پر میل جول اور طرز عمل کے احکام جن کے لئے عموماً فقہ اسلامی میں "الحظر والاباحۃ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، یعنی عام معاشرتی سطح پر کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ قانون کے اس شعبہ کا مقصد بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ کے امتیازی اوصاف کا تحفظ اور اسلامی شخصیت کی بقاء ہے۔ دنیا کے ہر نظام، ہر قانون اور ہر تہذیب کی طرح اسلام بھی اپنے نظام، قانون اور تہذیب کی انفرادیت کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے لئے مناسب اور ضروری تدابیر اختیار کرتا ہے۔

الحظر والاباحۃ کے احکام اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہیں۔ اس ضابطہ میں کھانے پینے کے آداب، حلال و حرام کی تفصیلات، عام معاشرتی سطح پر افراد کا میل جول، غیر مسلموں سے روابط کے انداز، شادی بیاہ کے طریقے اور حدود، لباس اور پردہ کے احکام، رہن سہن کے اصول و قواعد، عام برتاؤ، اور اس جیسے دیگر امور سے بحث کی جاتی ہے۔

۵۔ الاحکام السلطانیہ، سیاست شرعیہ یا فقہ دستوری

یہ فقہ اسلامی کا پانچواں بڑا میدان ہے جو اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون سے بحث کرتا ہے۔ مسلم مفکرین اور فقہاء کے نزدیک

قانون اور نظام کی پابندی انسان کی بنیاد اور سرشت میں داخل ہے۔ وہ انسان کو محض معاشرتی حیوان نہیں مانتے بلکہ ایک ایسا سیاسی حیوان قرار دیتے ہیں جو قانون اور نظم و ضبط کی شعوری پابندی کرتا ہے۔ رومی قانون دانوں نے بھی (شاید مسلمانوں کے اثر سے) یہ کہا کہ جہاں معاشرہ ہو گا وہاں قانون بھی ہو گا' پھر جہاں قانون ہو گا وہاں قانون بنانے والے اور چلانے والے بھی ہوں گے' پھر وہاں قانون کو نافذ کرنے والے اور قانون کو توڑنے پر سزا دینے والے بھی ہوں گے۔ یہ فقہ اسلامی کا وہ شعبہ ہے جو بجا طور پر اسلام کا دستوری اور انتظامی قانون کہلاتا ہے۔

۶۔ فقہ الجنایات یعنی اسلام کا فوجداری قانون

جہاں قانون ہو گا وہاں قانون کو توڑنے والے بھی ہوں گے۔ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی معاشرہ ایسا نہیں گزرا جس میں جرائم کا ارتکاب کرنے والے ناپید ہو گئے ہوں۔ بہترین سے بہترین معاشروں میں بھی جرائم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ اگر جرائم کے ارتکاب سے کوئی معاشرہ سو فیصد پاک ہو سکتا تو وہ انبیاء علیہم السلام کا معاشرہ ہوتا لیکن شاید ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں فسق و فجور اور صلاح و تقویٰ دونوں رجحانات رکھے ہیں اور دونوں رجحانات کی طرف کھینچنے والی قوتیں انسانوں میں ودیعت کی گئی ہیں اور انہی دونوں قوتوں میں توازن پیدا کر کے بدی کی قوتوں کو قابو کرنا اور بھلائی کی قوتوں کو ابھارنا انسان کا فریضہ ہے۔ ایسے میں بدی کی قوت کو سرے سے مٹا دینا اللہ کی حکمتِ آزمائش اور دنیا کے دار الامتحان ہونے کے تصور کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

جرائم کے بارہ میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کو کم سے کم سطح پر لے آیا جائے' معاشرہ میں جرم کا ارتکاب انتہائی استثنائی صورت ہو جس سے معاشرہ کا مزاج انکار کرتا ہو اور عام لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں' جرم کا ارتکاب علانیہ نہ کیا جا سکتا ہو' ایک بار جرم ثابت ہو جانے پر قرار واقعی سزا دی جاتی ہو اور دوسرے ممکنہ مجرمین کے لئے اس کو عبرت بنا دیا جاتا ہو۔ جرائم کی سزائیں اور ان کا قانون وضع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے جرم کا تعین کیا جائے کہ جرم کیا ہے اور یہ طے کیا جائے کہ کسی فعل کو کب' کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت جرم قرار دیا جائے گا' وہ اسباب اور بنیادیں کون اور کن اصولوں کی اساس پر متعین کرے گا جن کی روشنی میں کسی فعل کو جرم قرار دیا جائے گا' پھر جو افعال جرم قرار دیے جائیں گے ان کی سزائیں کیا ہوں گی اور ان کا تعین کون اور کن اصولوں کی بنیاد پر کرے گا' پھر سزائیں کب اور کن حالات میں دی جائیں گی اور کب اور کن حالات میں ان کو معاف یا ختم یا کم کیا جا سکے گا' ان سب تفصیلات کے مجموعہ کا نام فقہ الجنایات ہے۔

۷۔ ادب القاضی

فقہ اسلامی کا ساتواں بڑا میدان ادب القاضی ہے جس کو بعض جدید عرب مصنفین فقہ المرافعات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ اسلامی قانون کا وہ شعبہ ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں قانون ضابطہ یا پرو سیجرل لاء کہا جا سکتا ہے۔ اس عنوان کے تحت فقہائے اسلام حسب ذیل موضوعات سے بحث کرتے ہیں:

ا۔ نظام قضاء و عدلیہ جو اسلام کے نظام عدل و احسان کے قیام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ قضاء کے زیر عنوان فقہائے کرام منصب قضاء کی اہمیت، کار قضاء کی فضیلت، قاضی کے تقرر، قاضی کی شرائط، منصب قضاء کی طلب، قاضی کے فرائض، قاضی کے تقرر اور عزل یعنی منصب سے علیحدگی، آداب عدالت، عہدہ داران عدالت، قاضی کی تنخواہ اور مراعات جیسے اہم موضوعات کا ذکر کرتے ہیں۔

ب۔ دعوی اور دعوی کے فریقین، وہ امور جن کا فیصلہ کرانے کے لئے عدالت میں جانا ضروری ہے اور وہ امور جن کا فیصلہ کرانے کے لئے عدالت میں جانا اور دعوی دائر کرنا ضروری نہیں، دعوی کے اسباب، ارکان اور شرائط، دعوی کے مندرجات اور تعارض و تناقض وغیرہ۔

ج۔ سماعت اور فیصلہ کا طریق کار، دائرہ اختیار، سمن اور طلبی، آداب کمرہ عدالت، جواب دعوی، حوالات اور حبس احتیاطی، فریق کی غیر حاضری میں فیصلہ، فیصلہ سے رجوع، فیصلہ پر نظر ثانی اور فیصلہ کے اثرات وغیرہ۔

د۔ ثبوت اور گواہی، شہادت، اوصاف گواہاں، گواہی کی شرائط، تزکیۃ الشہود، گواہوں کا اختلاف اور تضاد بیانی، قرینہ قاطعہ، ماہرین فن کی آراء، سرکاری اور عدالتی دستاویزات بطور ثبوت، اقرار، قسم اور نکول یعنی قسم سے انکار وغیرہ۔

ھ۔ نیم عدالتی ادارے، حسبہ اور محتسب، ولایت مظالم، ولایت جرائم، نظام افتاء، تحکیم اور ثالثی، وکالت اور قانونی مشورہ وغیرہ۔

۸۔ سیر یا الفقہ الدولی

اسلام کا بین الاقوامی قانون یا قانون بین الممالک جس کے لئے سیر کی اصطلاح دوسری صدی ہجری سے ہی رائج ہو گئی تھی۔ یہ اسلامی قانون کا وہ شعبہ ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں، اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں اور اسلامی حکومت اور اس کے باغیوں کے مابین تعلقات کو منظّم اور منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون کا وہ شعبہ ہے جس میں اولیت کا شرف فقہائے اسلام کو حاصل ہے۔ مغرب میں بین الاقوامی قانون کے جد امجد ھیوگو گروشیس (HUGO GROTIUS) سے تقریباً نو سو سال قبل دوسری صدی ہجری کے فقہائے اسلام نے قانون بین

الاقوام پر الگ اور مستقل بالذات کتابیں لکھنا شروع کر دی تھیں جن میں سے ایک درجن کے لگ بھگ مکمل یا نامکمل شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہیں۔

یہ اسلامی قانون یعنی فروع فقہ کا ایک مختصر سا موضوعاتی جائزہ تھا، اب فقہ کے دوسرے بڑے شعبے اصول فقہ کا ابتدائی تعارف پیش کیا جاتا ہے جو اس اختصاصی مطالعہ کا اصل موضوع ہے۔

اصولِ فقہ کی فنی تعریف

اصول فقہ کی درسی کتابوں میں جہاں اس علم کی فنی تعریف کی گئی ہے وہاں عموماً تعریف کے دو انداز اپنائے گئے ہیں۔ کچھ حضرات نے اصول فقہ کی بطور ایک مستقل بالذات اور جداگانہ علم کے تعریف کی ہے، جبکہ بعض حضرات نے لفظ اصول کی الگ وضاحت کی اور لفظ فقہ کی الگ اور اس طرح اصول فقہ کے مرکب اضافی کے معنی سمجھائے۔ ہم یہاں یہ دونوں انداز اپناتے ہوئے اصول فقہ کی دونوں قسم کی تعریفیں بیان کرتے ہیں۔

پہلے اسلوب کی رو سے اصول فقہ گو ایک مرکب اضافی ہے لیکن یہاں اس کی تعریف ایک مرکب اضافی کے طور پر نہیں بلکہ ایک مستقل بالذات اور جداگانہ علم کے طور پر کی جاتی ہے۔ اصول فقہ اس علم کا نام اور عنوان ہے اور اس کی تعریف اسی نام کی مناسبت اور حوالہ سے کی جانی چاہئے۔ گویا تعریف کرتے وقت الفاظ ''اصول فقہ'' کو مرکب الفاظ نہیں بلکہ ایک مفرد لفظ سمجھا جائے گا۔ اس اعتبار سے علمائے اصول نے اصول فقہ کی جو تعریفیں بیان کی ہیں ان میں دو اہم تعریفات یہاں بیان کی جاتی ہیں:

علمائے اصول کی غالب ترین اکثریت نے جن میں حنفی، مالکی اور حنبلی علمائے اصول شامل ہیں اصول فقہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اصول فقہ سے مراد وہ قواعد ہیں جن کے بحث، مطالعہ اور تحقیق کے ذریعہ احکام شرعیہ کا استنباط ان کے تفصیلی دلائل کی مدد سے کیا جا سکتا ہے، بالفاظ دیگر علم اصول فقہ ان قواعد کے علم کو کہتے ہیں جن کی مدد سے احکام شریعت معلوم کئے جا سکیں۔ یہاں قواعد سے مراد وہ عمومی اصول اور بنیادی تصورات ہیں جن سے شریعت کے جزوی احکام معلوم کئے جا سکیں۔ بعض حالات میں ان احکام کا علم قطعی اور یقینی طور پر ہو جاتا ہے اور بعض دیگر حالات میں ان احکام کا علم مکمل طور پر قطعی اور یقینی تو نہیں ہوتا البتہ ان احکام کے بارہ میں ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں عمومی اصولوں میں وہ اصول بھی شامل ہیں جن سے قرآن مجید اور سنت کے احکام کی تعبیر و تشریح کی جاتی ہے۔ مثلاً ''یہ اصول کہ شارع نے (قرآن اور سنت میں) جن جن باتوں کا حکم دیا ہے وہ شرعاً'' فرض اور واجب ہیں'، یا یہ اصول کہ قرآن و سنت میں بیان کردہ مطلق اور عمومی احکام کو قرآن و سنت ہی میں بیان کردہ مقید اور مخصوص احکام کی روشنی میں پڑھا اور سمجھا جائے گا، یا یہ اصول

کہ واضح اور قطعی احکام کو ان احکام پر ترجیح حاصل ہو گی جو کسی استدلال پر مبنی ہوں' یا یہ اصول کہ قرآن وسنت کے بلاواسطہ اور براہ راست احکام کو بالواسطہ اور اجتہاد پر مبنی احکام پر ترجیح حاصل ہو گی۔

اس تعریف میں بیان کردہ تفصیلی دلائل سے مراد مختلف جزوی اور فروعی احکام کے وہ دلائل وماٰخذ ہیں جن سے کوئی حکم ثابت ہو' مثلاً" چوری کی حرمت کی دلیل سورۃ مائدہ کی متعلقہ آیت جس میں قطع ید کا حکم اور چوری کے جرم کی وعید بیان ہوئی ہے (المائدہ ۵:۳۸)۔ ان تفصیلی دلائل سے بحث فقیہ کا کام ہے 'اصولی کا نہیں۔ اصولی (یعنی اصول فقہ کا ماہر) صرف عمومی اور کلی دلائل سے بحث کرتا ہے۔ تاہم علامہ شوکانیؒ (م ۱۲۵۰ھ) کی رائے میں یہاں دلائل کے ساتھ "تفصیلی" کی قید غیر ضروری ہے اس لئے کہ احکام کے استنباط سے مراد ہی تفصیلی دلائل کے ذریعہ استنباط احکام ہے۔ لہذا تفصیل کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔

مذکورہ بالا تعریف کے مقابلہ میں ایک دوسری تعریف شافعی علمائے اصول نے پیش کی ہے۔ ان کی رائے میں علم اصول فقہ نام ہے فقہ کے دلائل کو عمومی طور پر جان لینے کا اور ان دلائل سے استفادہ کے طریقہ کار اور شرائط سے واقفیت کا۔ شافعی علمائے اصول نے اس تعریف کی وضاحت میں طویل بحثیں کی ہیں اور مذکورہ بالا تعریف سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود دونوں تعریفات میں کوئی گہرا اور بنیادی فرق موجود نہیں ہے۔ علمائے اصول میں سے مشہور شافعی اصولی علامہ ابن الحاجبؒ (م ۶۳۰ھ) کی تعریف میں اختصار بھی ہے اور دیگر علمائے اصول کے مباحث کی جھلک بھی پائی جاتی ہے ان کی رائے میں اصول فقہ ان قواعد کے علم کا نام ہے جن کی مدد سے شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے اخذ کیا جا سکے۔

ایک اور شافعی فقیہ اور مشہور مفسر قرآن علامہ قاضی ناصر الدین بیضاویؒ (م ۶۸۵ھ) نے نسبتاً" زیادہ وضاحت سے اصول فقہ کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصول فقہ نام ہے فقہ کے دلائل کی اجمالی واقفیت کا' ان سے استفادہ کرنے کے عمل کا' اور استفادہ کرنے والے کی حالت یعنی شرائط اور کیفیات جاننے کا۔ بالفاظ دیگر فقہ کے تمام اجمالی دلائل کے متعلقہ مسائل کی تصدیق کرنے کا' چاہے ان پر اتفاق رائے ہو یا اختلاف پایا جاتا ہو' ان دلائل سے فقہی فروع کو اخذ کرنے کا طریقہ جاننے کا' ان سے احکام شریعت معلوم کرنے کا اور اس پورے عمل کو کرنے والے کی صفات و شرائط جاننے کا مجموعی نام اصول فقہ ہے۔

اصول فقہ کی تعریف کا دوسرا اسلوب' جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ ہے کہ اصول اور فقہ دونوں کی الگ الگ تعریف کر کے پھر علم کی الگ سے تعریف کی جائے اور پھر یہ دکھایا جائے کہ علم اصول الفقہ سے کیا مراد ہے۔ جن حضرات نے اس اسلوب کے مطابق علم اصول فقہ کی تعریف کی ہے انھوں نے علم کی حقیقت اور ماہیت پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ علم کی یہ بحثیں فقہ اور قانون کے مباحث سے کم اور فلسفہ اور بالخصوص فلسفہ علم

یعنی EPISTEMOLOGY سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں' علمائے اصول میں جو حضرات فلسفہ اور کلام کے بھی شہسوار ہیں انھوں نے خاص طور پر ان میدانوں میں جولانیاں دکھائی ہیں۔ چنانچہ امام فخرالدین رازیؒ (م۶۰۶ھ) اور علامہ سیف الدین آمدیؒ (م۶۳۱ھ) نے جہاں اصول اور فقہ کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں وہاں علم کے بارہ میں فلسفیانہ بحثیں بھی اٹھائی ہیں۔ علامہ آمدیؒ لکھتے ہیں کہ علم سے مراد وہ وصف ہے جس کا اگر کوئی شخص حامل ہو تو اس میں مجموعی اور کلی حقائق و معانی کے درمیان تمیز کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی موجودگی میں اس کے مخالف کسی احتمال کے سامنے آنے کا امکان نہیں رہتا۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ حافظ الدین ابو البرکات نسفیؒ (م۷۱۰ھ) نے بھی علم کی تعریف کا سوال اٹھایا لیکن یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ علم کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں' اس لئے کہ وہ اتنی واضح چیز ہے کہ اپنی وضاحت کی وجہ سے ہر قسم کی تعریف سے مستغنی ہے۔ مثال کے طور پر بھوکے شخص کو اپنی بھوک کا علم خود بخود ہو جاتا ہے اور اس کو پہلے بھوک کی فنی تعریف کرنے یا سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک صاحب علم کو یہ جاننے اور سمجھنے کے لئے کہ علم کیا ہے' علم کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ مسلم مفکرین کے ہاں سائنس اور نالج (KNOWLEDGE) دونوں کے لئے علم ہی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ چنانچہ علامہ نسفیؒ نے یہاں علم کے بارہ میں جو کچھ کہا ہے وہ نالج کے بارہ میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن سائنس کے بارہ میں اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔

علم کی تعریف کے بعد اصول اور فقہ کی الگ الگ تعریفیں کی جاتی ہیں جن سے مجموعی طور پر علم اصول فقہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ لفظ فقہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اصول اصل کی جمع ہے جس سے مراد درخت کی جڑ یا عمارت کی بنیاد ہوتی ہے۔ چنانچہ علم فقہ کو اگر ایک عمارت سے تشبیہ دی جائے تو علم اصول اس عمارت کی بنیاد قرار پائے گا۔ اسی لئے اصول سے مراد وہ امور بھی ہوتے ہیں جن پر کسی دوسری چیز کے صحیح یا غلط یا قابل قبول ہونے یا ناقابل قبول ہونے کا دارومدار ہو۔ اس مفہوم کی رو سے اصول فقہ سے مراد وہ امور ہوں گے جن پر فقہ اور اس کے احکام کا دارومدار ہو' جن کی مدد سے فقہی مسائل کے صحیح یا غلط ہونے اور فقہی آراء و اجتہادات کے قابل قبول ہونے یا ناقابل قبول ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

اصولِ فقہ کے احکام میں ایک بڑا حصہ تو ان قواعد و ضوابط یا اصولوں کا ہے جو قرآن و سنت کی تفہیم و تفسیر میں استعمال ہوتے ہیں یا دیگر ادلہ شرعیہ سے استنباط مسائل کے عمل اور اس کی شرائط و تفصیلات سے بحث کرتے ہیں۔ دوسرا بڑا حصہ وہ ہے جن کو قواعد قطعیہ کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں حصوں میں براہ راست قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کئے ہوئے احکام کا حصہ بہت نمایاں اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اصولِ فقہ کی ضرورت: مقاصد اور غرض وغایت

علمائے اسلام نے مختلف علوم کی غرض وغایت اور مقاصد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اسلام کے تصور علم اور مسلمانوں کے نظریہ تعلیم میں بھی علم کے اہداف و مقاصد اور غرض وغایت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اہداف و مقاصد تعمیری، مثبت اور بامعنی ہوں تو علم علم نافع ہے، اگر کسی علم غرض وغایت منفی مقاصد کا حصول ہو تو وہ علم غیر نافع اور ضرر رساں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی ہمیشہ علم نافع کی دعا فرمائی اور غیر نافع سے پناہ مانگی اور امت کو بھی یہی سکھایا۔ اس نبوی تعلیم کے زیر اثر یہ بات مسلمانوں کے علمی مزاج کا حصہ بن گئی کہ وہ جب کسی علم وفن حاصل کرنے کا ارادہ کریں تو آغاز اس کی غرض وغایت اور اہداف و مقاصد سے کریں تاکہ روز اول ہی سے یہ بات طالب علم کے ذہن نشین جائے کہ جس علم کو وہ حاصل کرنے کا آغاز کر رہا ہے وہ ایک تعمیری، بامقصد، مثبت اور بامعنی کاوش ہے اور کوئی فضول، بے کار، انسانیت دشمن یا بے مقصد سرگرمی نہیں جس میں مشغول ہونا اضاعتِ وقت اور اضاعتِ سرمایہ کے مترادف ہو۔

اس روایت کے تحت علمائے اصول نے علم اصول فقہ کی جو غرض وغایت بیان کی ہے اس کی مختصر تشریح کرنے کے لئے ضروری ہے علمائے اصول نے اصول فقہ کے مقام و مرتبہ اور علوم اسلامی میں اس کی حیثیت اور درجہ کے بارہ میں جو لکھا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈا لی جائے۔

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) اپنی مایہ ناز کتاب "المستصفیٰ" میں آغازِ کتاب ہی میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھے ہیں کہ علم اصول فقہ تمام اسلامی علوم کا گلِ سر سبد اور اشرف العلوم ہے۔ اس لئے کہ اس میں عقل و نقل دونوں سے کسب فیض کیا گیا ہے۔ اس کی اساس اور بنیاد شریعت الٰہی ہے، لیکن ان روحانی بنیادوں پر خالص عقلی استدلال اور منطقی ترتیب سے پورے علم کی عمارت استوار کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ علم اصول فقہ کے قواعد و کلیات شریعت اور عقل دونوں کے تقاضوں سے کلی طور پر ہم آہنگ ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل امام غزالیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ علوم کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ علوم جو خالصتاً "عقلی" ہیں، یعنی جن میں بنیادی حوالہ انسان کی اپنی عقل اور فہم ہے۔

۲۔ وہ علوم جو خالصتاً "نقلی" ہیں، یعنی جن میں بنیادی حوالہ انسان کی عقل و فہم کے بجائے نقل یعنی روایت پر ہو۔ نقل میں پھر خالص نقل و روایت وہ ہے، جو بالآخر نبی اور پیغمبر سے روایت پر مبنی ہو۔

۳۔ وہ علوم جو مذکورہ بالا دونوں قسم کے علوم کے امتیازی اوصاف کا مجموعہ ہوں۔ یعنی وہ علوم جن کا بنیادی حوالہ نقل و روایت بھی ہو اور انسانی عقل و فہم بھی۔

جو علوم خالص عقلی ہیں ان کو لوگ خود اپنی عقل و فہم اور مشاہدہ و تجربہ سے حاصل کر سکتے ہیں' ان کے حصول کے لئے شریعت اور وحی الٰہی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے شریعت اسلامی نے صرف ان کا جائز ہونا بیان کرنے پر اکتفاء کیا اور اس سے آگے بڑھ کر ان علوم کے حصول کی ترغیب کا اہتمام نہیں کیا۔ ایسے علوم میں حساب' ریاضی' ہندسہ (انجینیرنگ) اور علم فلکیات وغیرہ شامل ہیں۔ پھر ایسے علوم کی مزید دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس میں بیشتر حصہ محض اندازوں اور خوش فہمیوں پر مشتمل ہے جیسے علوم نجوم۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے آخرت میں کوئی فائدہ یا نفع متوقع نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علوم کی ہے جو عقل و تجربہ کی میزان میں پورے اترتے ہیں اور ان کو دنیوی نفع کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اجر کے حصول کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان علوم کے حصول کے لئے عقلی کاوشوں' غور و فکر' تجربہ اور مشاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسری طرف جو علوم محض نقلی ہیں اور جن میں آخری اور بنیادی حوالہ وحی الٰہی ہے جیسے علم تفسیر اور علم حدیث' ان میں عقلی کاوشوں سے زیادہ قوت حافظہ اور یادداشت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جتنی جس کی قوت حافظہ اور یادداشت ہوگی اتنا ہی وہ ان علوم میں کمال حاصل کرے گا۔

ان دونوں قسموں کے مقابلہ میں جو علوم جامعیت کی شان رکھتے ہیں اور مذکورہ بالا دونوں قسم کے علوم میں پائے جانے والے امتیازی اوصاف کا مجموعہ ہیں وہ لامحالہ ان دونوں سے افضل اور اشرف قرار دیے جائیں گے اس لئے کہ وہ عقل اور نقل دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ان میں فکر نو اور روایت ساتھ ساتھ چلتے ہیں' ان میں بیک وقت قدیم کا تسلسل بھی ہے اور جدید کا تنوع اور رنگا رنگی بھی۔ امام غزالیؒ کے نزدیک فقہ اور اصول فقہ ایسے ہی علوم ہیں جو بیک وقت شریعت اسلامی اور وحی الٰہی کے چشمہ صافی سے بھی فیضیاب ہیں اور انسانی عقل و فکر کی کھلی فضاؤں میں پرواز کے بھی ضامن ہیں۔ یہاں نہ محض ایسا عقلیت پسندانہ تفکر ہے جو نور شریعت سے مستنیر نہ ہو اور نہ ایسی روایت پسندی اور نقل پرستی ہے جس کی اساس محض کورانہ تقلید پر ہو۔ خاص طور پر اصول فقہ تو بیک وقت وحی الٰہی اور عقل انسانی دونوں سے یکساں طور پر مستفید اور دونوں سے کلی طور پر مستنیر ہے۔ اس لئے امام غزالیؒ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اصول فقہ اسلامی علوم و فنون میں سب سے اعلیٰ و اشرف علم ہے اور اس کے افضل العلوم ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اصول فقہ کے ان امتیازی اوصاف کا بہت سے انصاف پسند غیر مسلم اہل علم نے بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر ایچ اے آر گب (GIBB) نے فقہی علوم کو اسلام کے ذخیرہ علم میں ماسٹر سائنس قرار دیا ہے جس کا مثیل اپنی جامعیت اور

انفرادیت میں دنیا کی کسی دوسری روایت میں ملنا مشکل ہے۔

اصول فقہ کی غرض و غایت کے بارے میں علمائے اصول نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل امور کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

١۔ رضائے الٰہی کا حصول، بایں طور کہ اصول فقہ کے قواعد و احکام سے کام لے کر اللہ رب العزت کی مرضی اور منشاء معلوم کیا جائے اور پھر اس کے مطابق زندگی گزاری جائے۔

٢۔ روز مرہ کے فقہی احکام و مسائل کے شرعی ماخذ و دلائل سے واقفیت حاصل کر کے ان کی حقانیت کے بارہ میں اطمینان قلبی حاصل کیا جائے اور پوری جمعیت خاطر کے ساتھ ان پر عملدرآمد کی کوشش کی جائے۔

٣۔ شرعی احکام کے استنباط و استدلال کے اسالیب کا علم حاصل کر کے اس خطرہ کا سد باب کیا جائے کہ کسی معاملہ میں حکم الٰہی اور منشائے ربانی کے خلاف کوئی عمل سرزد ہو جائے۔

٤۔ تحفظ دین و عقیدہ جو اسلامی شریعت کا سب سے بڑا اور اولین مقصد ہے اس کے لئے مضبوط عقلی اور عملی بنیاد فراہم کی جائے۔

٥۔ بدعقیدہ، بددین اور گمراہ لوگوں کے شبہات سے دین اور احکام دین پر ایمان کو محفوظ رکھا جائے۔

٦۔ ان تمام مقاصد اور اغراض و غایات کے نتیجہ میں دنیا اور آخرت کی سعادتیں حاصل کی جائیں۔

اصولِ فقہ کا آغاز اور ابتدائی ارتقاء

غور سے دیکھا جائے تو اصول فقہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود فقہ کی۔ اصول فقہ کا آغاز بھی اسی وقت ہو گیا تھا جب فقہ کا آغاز ہوا تھا۔ لہٰذا فقہ اور اصول فقہ کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے مباحث میں خاصی یکسانیت سی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور کی حد تک فقہ اور اصول فقہ کی تاریخ کو الگ الگ ممیز طور پر بیان کرنا بڑا دشوار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جب صحابہ کرامؓ کو بالعموم اور خلفائے راشدینؓ کو بالخصوص نئے نئے مسائل اور گوناگوں مشکلات سے واسطہ پڑا تو انھوں نے ان کے جواب اور حل کے لئے قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح راہنمائی حاصل کی جیسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے دوران آپ سے حاصل کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد اور قیاس کی صحابہ کرامؓ کو اپنی ذاتی نگرانی میں خود تربیت دی تھی جس کی مثالیں سنت کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جب بطور گورنر یمن روانگی کے وقت حضور علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں کہ اگر کسی معاملہ کا حل

قرآن یا سنت میں نہ ملا تو کیا کرو گے' یہ جواب دیا تھا کہ اپنی رائے اور فہم کے مطابق اجتہاد کروں گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس کی تصویب فرمائی تھی بلکہ اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار بھی فرمایا تھا(۴) ـ گویا اجتہاد کا اصول عہد نبوی میں نہ صرف عملاً روبعمل آنا شروع ہو گیا تھا بلکہ اس کو ایک طے شدہ ماخذ قانون کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی ـ

عہد نبوی میں صحابہ کرامؓ کے قیاس کے ذریعہ حکم شرعی معلوم کرنے کے واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ علامہ ابن عقیلؒ حنبلی (م ۵۱۳ ھ) نے ان واقعات کو متواتر قرار دیا ہے جن سے علم قطعی حاصل ہو جاتا ہے ـ قیاس کی طرح کتب حدیث میں صحابہ کرامؓ کی طرف سے استدلال' استحسان اور استصحاب کے اصولوں پر عمل کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں ـ صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں اسی تربیت نبوی سے کام لیتے ہوئے اجتہاد و قیاس اور استدلال و استحسان کے اصولوں پر عمل کیا گیا اور اصول فقہ کے ایسے اصول و کلیات طے پا گئے جن پر اس پورے علم کا دارومدار ہے ـ

یہاں ہم چند ایسے اہم اصولی احکام و کلیات کا ذکر کرتے ہیں جو عہد صحابہؓ میں طے کئے گئے اور جن کی بنیاد پر اصول فقہ کے بہت سے اصول و احکام مرتب کئے گئے ـ اوپر اجتہاد و قیاس کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ان دونوں اصولوں پر عمل درآمد شروع ہو گیا تھا ـ صحابہ کرامؓ جب بھی اجتہاد سے کام لیتے یا قیاس کی بنیاد پر کوئی حکم دریافت کرتے تو اس کو فوراً" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے' اگر وہ اجتہاد درست ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی توثیق فرما دیتے ورنہ اس میں مناسب اصلاح فرما دیتے تھے ـ اور غلطی کی نشان دہی کر دیتے تھے ـ عہد نبوی میں اجماع کا کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا تھا ـ اس لیے کہ اجماع کی تعریف ہی یہ ہے کہ کسی ایسے معاملہ میں جہاں کتاب و سنت کی براہ راست راہنمائی دستیاب نہ ہو امت مسلمہ کے تمام مجتہدین مل کر کسی ایک اجتہاد پر اتفاق کر لیں ـ ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آ سکتی تھی ـ

واضح رہے کہ اصول فقہ کے مباحث میں جس چیز کو قیاس (یعنی ANALOGICAL REASONING) کہا جاتا ہے وہ یونانی منطق کے قیاس (یعنی SYLLOGISM) سے مختلف چیز ہے ـ یونانی اسلوب قیاس میں حکم کلی کی مدد سے حکم جزئی معلوم کیا جاتا ہے' یا حکم عام سے حکم خاص کا پتا چلایا جاتا ہے ـ اس کے برعکس اصول فقہ کے قیاس میں جزئی حکم سے جزئی حکم معلوم کیا جاتا ہے ـ محض لفظ قیاس کے اشتراک سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اصول فقہ کا قیاس یونانی تصورات کے زیر اثر سامنے آیا ـ ماضی قریب کے مشہور مفکر و مورخ ڈاکٹر علی

۴ـ جامع ترمذی' ابواب الاحکام' باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی

سامی نشار نے لکھا ہے کہ علمائے اصول کا تصور قیاس علم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقیب تھا - اس نے ایک ایسے منہاج تحقیق (RESEARCH METHODOLOGY) کو جنم دیا جس نے آگے چل کر استقرائی (INDUCTIVE) اور تجربی (EMPIRICAL) مناہج کو فروغ دیا - قیاس پر مزید گفتگو اس اختصاصی مطالعہ میں آگے چل کر ایک الگ درسی اکائی میں آئے گی۔

تاہم رسول اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق کتاب وسنت کے بعد قیاس یا اجتہاد کو نہیں بلکہ اجماع کو تیسرا درجہ دیا اور اس کی بنیاد پر معاملات کا فیصلہ کرنے کی طرح ڈالی - محدثین نے مشہور تابعی میمون بن مہرانؒ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا تھا تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کرتے تھے - وہاں اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق اس کا فیصلہ کر دیتے تھے - کتاب اللہ میں اس معاملہ کا حل نہ ملتا تو اگر خود ان کے علم میں کوئی حدیث ہوتی جس کی روشنی میں معاملہ نبٹایا جا سکتا تو اس کے مطابق اس کا فیصلہ کرتے، ورنہ مسلمانوں سے معلوم کرتے کہ کیا ان میں سے کسی کے علم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کا کیا فیصلہ فرمایا ہے - اگر کسی کے پاس متعلقہ معاملہ کے بارہ میں کوئی حدیث ہوتی تو وہ پیش کر دیتا اور یوں معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا - اگر ایسا نہ ہو سکتا تو وہ سربرآوردہ لوگوں (رؤوس الناس) اور بہترین افراد (خیار الناس) کو جمع کرتے، ان سے مشورہ کرتے اور جب ان کی رائے کسی ایک معاملہ میں متفق ہو جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے[۵] - یہی طرز عمل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کا بھی رہا - انھوں نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے راہنمائی نہ ملنے کی صورت میں وہ اجماع سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور کی نظیر دریافت کرتے اور اگر کوئی نظیر مل جاتی تو اس کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کر دیتے - اور اگر کسی معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نظیر بھی نہ ملتی تو پھر اجماع امت کا بندوبست و اہتمام فرماتے۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں اصول فقہ کے جو تصورات اور قواعد سامنے آئے جن پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا ان میں سے چند بطور مثال درج ذیل ہیں:

۱- قرآن و سنت میں اگر ایک موضوع سے متعلق دو حکم ملتے ہوں تو بعد والے حکم کو پہلے والے حکم کا ناسخ یا مخصص قرار دیا جائے گا - یعنی پہلا حکم یا تو منسوخ قرار دیا جائے گا یا اس کے انطباق کو دوسرے حکم کی روشنی میں محدود یا مخصوص کر دیا جائے گا - محدثین نے روایت کیا ہے کہ صحابی جلیل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی بیوہ خاتون امید سے ہو تو اس کی عدت کیا ہے؟ اس سوال کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۴ میں بیوہ کی عدت چار مہینہ دس دن بیان ہوئی ہے، اور سورۃ الطلاق کی

۵- سنن الدارمی، باب الفتیا و ما فیہ من الشدۃ

آیت ۵ میں حاملہ کی عدت وضع حمل بیان کی گئی ہے۔ اب اگر کوئی خاتون بیوہ بھی ہو اور حاملہ بھی تو اس کی عدت کیا ہوگی۔ اس پر صحابہ کرامؓ کے مابین اختلاف رائے ہوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ چھوٹی سورت النساء (یعنی سورت الطلاق) بڑی سورت النساء (یعنی سورت البقرہ) کے بعد نازل ہوئی تھی (۶)۔ گویا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ یہ اصول بیان فرما رہے تھے کہ بعد والا حکم پہلے والے حکم کا مخصص، مقید یا ناسخ ہوتا ہے۔

۲۔ کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ اس فیصلہ سے بالآخر کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اسی طرح کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ اگر کسی چیز کے نتائج غلط نکل رہے ہوں تو اس کو ناجائز قرار دیا جانا چاہئے۔ اس اصول کی بنیاد پر خود قرآن پاک میں کئی احکام دیے گئے ہیں۔ احادیث میں بہت سے معاملات میں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اس اصول کی بنیاد پر بہت سے معاملات کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شراب خوری کی سزا کے تعین کی بابت مشورہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے لئے اسی کوڑوں کی سزا تجویز کی اور فرمایا کہ جو شراب پیتا ہے وہ نشہ میں آکر ہذیان بکتا ہے، اور جو شخص ہذیان بکتا ہے وہ بہتان طرازی بھی کر گزرتا ہے جس کی سزا اسی کوڑے ہے (۷)۔ لہٰذا شراب نوشی کی سزا بھی اسی کوڑے ہی ہونی چاہئے۔ قانون سازی کا یہ اصول اصطلاح میں حکم بالمآل کہلاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کی بابت فیصلہ کرنے میں اس کے انجام اور نتائج کو پیش نظر رکھنا۔

۳۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانہ میں یمن میں ایک عورت نے اپنے آشنا اور اس کے ایک ملازم سے مل کر اپنے سوتیلے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ یمن کے گورنر حضرت یعلی نے امیر المومنین کو ریفرنس بھیجا اور پوچھا کہ اس صورت حال میں کیا حکم ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جواب میں لکھا کہ ان سب لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور فرمایا کہ اگر صنعاء (یمن کے دارالحکومت) کے تمام باشندے اس بچے کے قتل میں شریک ہوتے تو میں ان سب کو اس بچہ کے قصاص میں قتل کرا دیتا (۸)۔ یہاں واضح طور پر آنجناب نے سدِّ ذریعہ کے اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے تمالؤ کا قاعدہ وضع کیا۔

۴۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے کسی مستغیث کی شکایت پر ایک خاتون کو طلب فرمایا۔ آنجناب کی طلبی کا حکم آنے سے وہ ایسے خوف اور دہشت کا شکار ہوئی کہ اس کو اسقاط حمل ہو گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ اس بچہ کی دیت آپ پر واجب

۶۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ والذین یتوفون منکم.....

۷۔ موطا امام مالک، کتاب الاشربہ، باب ماجاء فی حد الخمر

۸۔ السنن الکبریٰ از بیہقی، کتاب الجنایات، باب النفر یقتلون الرجل

ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ رائے قبول کی اور اپنی عاقلہ کے ذریعہ مرنے والے بچہ کی دیت ادا کرائی (۹) ۔اس رائے کے قائم کرنے میں ان دونوں اکابر صحابہؓ نے قیاس سے کام لیا۔

عہد صحابہؓ میں اصولی مباحث

دور صحابہ کرامؓ میں اصول فقہ کے قواعد و کلیات کی جامع ترین تلخیص حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور و معروف خط میں ملتی ہے جو آنجناب نے بصرہ کے چیف جسٹس اور صحابی جلیل حضرت ابو موسی اشعریؓ کو لکھا تھا۔ اصلاً تو یہ خط اسلام کے قانون ضابطہ کے بارہ میں ضروری ہدایات پر مشتمل ہے لیکن اس میں بڑی اہم اصولی بحثیں بھی آ گئی ہیں۔ ذیل میں تاریخ کی اس نہایت اہم قانونی دستاویز کا ترجمہ اور مختصر تشریح دی جا رہی ہے جس سے دور صحابہؓ میں اصول فقہ کی بنیادوں کی تشکیل کے انداز و رجحان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

حضرت عمرؓ کا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام خط

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

اللہ کے بندے عمر بن الخطاب امیر المومنین کی طرف سے عبد اللہ بن قیس (ابو موسی اشعری) کے نام۔

السلام علیکم

امابعد!

نظام قضاء کا قیام ایک محکم فریضہ اور ایک ایسی سنت ہے جس کا ہمیشہ اتباع کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو تو تم پہلے اس کو اچھی طرح سمجھ لو، اس لئے کہ جو حق نافذ نہ کیا جا سکے اس کے بارے میں باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

اپنی نشست و برخاست اور چہرے کے تاثرات تک میں لوگوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم رکھو تاکہ کوئی بااثر آدمی یہ غلط امید نہ رکھے کہ تم سے کسی کے خلاف کوئی زیادتی کرا لے گا اور کوئی کمزور شخص اس سے مایوس نہ ہو کہ اس کو تمھارے ہاں سے عدل و انصاف ملے گا اور اسی طرح کوئی کمزور شخص تمھاری سختی سے خوفزدہ نہ ہو۔

بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے، اور قسم اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دعوی کی صحت کا انکار کر رہا ہو۔ لوگوں (بعض روایات کے الفاظ ہیں: مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح، مصالحت اور راضی نامہ جائز ہے، سوائے اس صلح یا راضی نامہ کے جو کسی حرام کو حلال قرار دے دے یا کسی حلال کو حرام قرار دے دے۔

۹۔ المصنف از عبد الرزاق، کتاب العقول، باب من افزعہ السلطان۔

اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ہے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور و فکر کیا ہے اور تم کو راہ راست کی طرف راہنمائی حاصل ہو گئی ہے تو محض یہ بات کہ تم کل ایک فیصلہ کر چکے ہو تمہیں ہر گز ہر گز حق کی طرف رجوع کرنے سے باز نہ رکھے' اس لئے کہ یاد رکھو حق ایک اٹل حقیقت ہے اس کو کوئی دوسری چیز باطل یا غلط نہیں ٹھہرا سکتی اور یاد رکھو کہ باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ حق کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

جن معاملات میں قرآن و سنت کی کوئی ہدایت موجود نہیں اور وہ تمہارے دل میں کھٹکتے ہیں ان کے بارے میں خوب غور و فکر اور سمجھ بوجھ سے کام لو۔ ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لئے تم پہلے قرآن و سنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کر لو' اس کے بعد جو حل تمہاری رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب' اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ہو اس کو اختیار کر لو۔

جو شخص تمہارے سامنے یہ دعوی کرے کہ اس کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے، جو اس وقت وہ پیش کرنے سے قاصر ہے تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کر سکے' اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا حق لے لے گا' ورنہ بصورت دیگر تمہارے لئے جائز ہو گا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو' اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس کو کوئی عذر پیش کرنے کا موقعہ نہ ملے گا اور اس کی بے بصیرتی اس پر واضح ہو جائے گی۔

مسلمان سب کے سب عادل ہیں اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ہے' سوائے اس شخص کے جس کو کوئی سزائے حد دی گئی ہو' یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے' یا اس (کی جانبداری) کے بارے میں اس وجہ سے کوئی بدگمانی کی جا رہی ہو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ہے۔

جہاں تک (گواہی کے معاملہ میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی ہے' اب تمہاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ کرو' اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حدود سے بچا لیا ہے کہ سوائے واضح اور مضبوط ثبوت یا قسم (حلفیہ اقرار) کے حد جاری نہیں ہو سکتی۔

(کمرہ عدالت میں) غصہ سے پرہیز کرو' تنگدلی اور پریشانی سے بچو' لوگوں کی مقدمہ بازی سے اکتاہٹ اور تکلیف محسوس نہ کرو' اس لئے کہ یہی وہ مواقع ہیں جہاں تمہیں حق نافذ کرنا ہے۔ یہ کام تمہارے لئے اللہ کے ہاں اجر کا موجب اور آخرت میں بہترین ذخیرہ کا سبب بنے گا۔ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان حق کے معاملہ میں نیت کو صاف اور خالص کر لیتا ہے' چاہے اس کا نتیجہ اس کے اپنے ہی خلاف پڑ رہا ہو' تو اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملات کو بھی صاف اور خالص کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص دنیا کے سامنے خود کو اس طرح مزین کر کے پیش کرے گا کہ اصل حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس سے مختلف ہو تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ رسوا کرے گا' اس لئے کہ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف وہی عبادت قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لئے ہو' تو بتاؤ! تمہارا کیا خیال ہے اس اجر و ثواب کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی رزق اور اخروی خزائن رحمت کی شکل میں بندوں کے لئے محفوظ کر رکھا ہے؟ (کیا اس کا مستحق کوئی غیر مخلص شخص ہو سکتا ہے؟) والسلام علیکم (۱۰)-

حضرت عمرؓ کے خط پر ایک نظر

نامناسب نہ ہو گا اگر یہاں اس اہم اور تاریخی دستاویز کی مختصر تشریح بھی دے دی جائے اور اس دستاویز میں جو اہم اصولی اور قانونی سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کی وضاحت اور نشاندہی بھی کر دی جائے۔ ذیل کی اس مختصر تشریح میں حافظ ابن القیم الجوزیہؒ (م ۷۵۱ھ) کی اس عالمانہ اور فاضلانہ شرح سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو ان کی مایہ ناز تالیف "اعلام الموقعین" میں شامل ہے۔ علامہ ابن القیمؒ کی اس شرح کا مکمل ترجمہ تو طویل فرصت کا متقاضی ہے۔ یہاں اس کے اہم مباحث کی تلخیص پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ 'مشہور اور جلیل القدر صحابی ہیں' اصل اسم گرامی عبداللہ بن قیسؓ ہے۔ مکہ مکرمہ میں ہی اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لے آئے تھے گو اصل میں رہنے والے یمن کے تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آبسے تھے۔ آپؓ نے حبشہ بھی ہجرت فرمائی تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ بھی دیگر مہاجرین حبشہ کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور پھر قریب قریب تمام غزوات و مہمات میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش شرکت کی۔ ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کے علاقوں زبید اور عدن کا گورنر مقرر فرمایا۔ ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپؓ کو بصرہ کا گورنر اور صدر قاضی مقرر کیا۔ اس حیثیت میں آپ نے وہاں بہت سے تاریخی کارنامے انجام دیئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے جن حکام و قضاۃ پر بہت گہرا اعتماد تھا ان میں سے ایک حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ 'ان کو وقتاً فوقتاً' بہت سے خطوط اور مراسلے لکھتے رہتے تھے جن میں سے بعض کا ذکر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے' چند ایک کا متن بھی محدثین و مورخین نے محفوظ رکھا ہے۔ خود حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا طریقہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے ان تمام خطوط کی نقلیں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اپنے انتقال کے وقت انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی وفات کے بعد یہ قیمتی ذخیرہ ان کے صاحبزادے حضرت ابو بردہؓ کو دے دیا جائے جو خود بھی شرف صحابیت سے ممتاز تھے۔ چنانچہ یہ سارے خطوط حضرت ابو بردہؓ کو مل گئے جو ان کی روایت بھی کیا کرتے تھے اور مشتاقان علم کو ان کی نقلیں بھی دے دیا کرتے تھے۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) بیان کرتے ہیں کہ ان سے ابو عبداللہ بن ادریسؒ نے بیان کیا کہ ایک روز میں

۱۰۔ یہ خط علامہ ابن القیمؒ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین عن رب العالمین" فصل خطاب عمرؓ الی ابی موسیٰ میں تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت ابو بردہؒ کے صاحبزادے سعید بن ابی بردہؒ کے ہاں گیا اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے وہ خطوط دکھادیں جو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھے تھے اور انہوں نے وہ سب آپ کے والد کو دے دیئے تھے۔ ابو عبداللہ بن ادریسؒ کہتے ہیں کہ سعید بن ابی بردہؒ گئے اور بہت سے خطوط نکال کر لائے، ان میں یہ خط بھی تھا۔ اس تحریری شہادت کے علاوہ تابعین کی ایک بڑی تعداد نے اس خط کی زبانی روایت بھی کی ہے۔

۱۔ ''جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔''

جاننا چاہیے کہ کوئی مفتی یا حاکم عدالت اس وقت تک نہ تو حق کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے اور نہ فتویٰ جاری کر سکتا ہے جب تک اس کو فہم صحیح کی نعمت سے نہ نوازا جائے۔ فہم صحیح اور نیک نیتی، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی وہ جلیل القدر اور عظیم الشان نعمتیں ہیں جن سے بڑھ کر صرف نعمتِ اسلام ہی ہو سکتی ہے۔ بلکہ صحیح اسلام کی بنیاد ہی یہ دو دونوں چیزیں ہیں اور اسلام کی اساس انہی دونوں پر قائم ہے۔

ایک قاضی اور مفتی کو دو قسم کی فہم کی ضرورت پڑتی ہے:

۱۔ سب سے پہلے تو اس واقعہ کی صحیح سمجھ جو پیش آیا ہے۔ یہ سمجھ قرائن، علامات اور دوسری نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرے اس بات کی سمجھ کہ اس پیش آمدہ واقعہ میں کیا کرنا چاہئے، یعنی اس معاملہ میں وہ حکم شرعی کیا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اب جو شخص بھی اس معاملہ میں مقدور بھر کوشش کرے گا اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس کام میں بروئے کار لائے گا وہ ایک یا دو گنے اجر کا ضرور مستحق ہو گا۔ صحیح اور حقیقی عالم وہی ہے جو واقعہ کی صحیح فہم حاصل کر کے اس میں غور و فکر کرے اور اس غور و فکر کے ذریعہ اس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی پتا چل جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں گواہ نے ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھ کر فوراً یہ پتا لگالیا کہ حضرت یوسف بالکل بری اور پاکدامن ہیں اور اپنے بیان میں سچے ہیں (یوسف ۱۲:۲۶ تا ۲۸) یا جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ چھری لاؤ! میں اس بچہ کو کاٹ کر تم دونوں میں تقسیم کر دوں، بچہ کی دعویدار دونوں عورتوں میں سے اس کی اصل ماں کو پہچان لیا(۱۱)، یا جس طرح حضرت علیؓ نے اس عورت سے جو حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا خط لے کر جا رہی تھی یہ کہہ کر خط برآمد کرا لیا کہ اگر تو نے خط نکال کر نہ دیا تو ہم تجھے برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے(۱۲)۔

۱۱۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قال اللہ تعالیٰ و ھبنا لداود سلیمان نعم العبد

۱۲۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح وما بعث حاطب بن ابی بلتعہ الی اھل مکہ......

جو شخص بھی شریعت کے احکام اور صحابہ کرامؓ کے فیصلوں کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو جابجا یہی نکتہ کار فرما ملے گا لیکن جو شخص اس نکتہ کو سمجھے بغیر یہ کام کرے گا وہ لوگوں کے حقوق بھی ضائع کرے گا اور شریعت کو بھی بدنام کرے گا اور اس کی طرف غلط باتیں منسوب ہوں گی۔

۲۔ "جو حق نافذ نہ کیا جاسکے اس کے بارے میں باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں۔"

حضرت عمرؓ کا مقصود یہاں حق کے نفاذ کی اہمیت ظاہر کرنا ہے۔ اگر حاکم عدالت یا حکومت کسی کے حق کو تسلیم تو کرے لیکن یا تو اس کو نافذ نہ کرے یا نافذ کرنے کی اس میں قدرت و اہلیت نہ ہو تو پھر محض زبانی اس کو تسلیم کرنا بیکار ہے۔ حقدار کو اس زبانی تسلیم کرنے سے آخر کیا فائدہ ہوگا؟

۳۔ "بار ثبوت مدعی کے ذمہ ہے، اور قسم اس شخص کی ذمہ داری ہے جو دعوی کی صحت سے انکار کر رہا ہو۔"

اصل عربی الفاظ ہیں: البینہ علی المدعی یعنی واضح ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ قرآن مجید، احادیث اور صحابہ کرامؓ کے اقوال میں جہاں جہاں بینہ کا استعمال ہوا ہے اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو حق کو پورے طور پر واضح اور پورے طور پر ثابت کردے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو (حق کی) واضح اور کھلی نشانیاں دے کر بھیجا۔

۲۔ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ (الانعام ۶:۵۷)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اس واضح اور قطعی دلیل پر قائم ہوں جو میرے رب کی طرف سے آئی ہے۔

۳۔ آتَیْنٰھُمْ کِتٰبًا فَھُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْہُ (فاطر ۳۵:۴۰)

ہم نے ان لوگوں کو کتاب دی، پس اب وہ اس کی فراہم کردہ ایک واضح دلیل رکھتے ہیں۔

ایسی آیات قرآن مجید میں بے شمار ہیں۔ ان میں سے کسی بھی آیت میں بینہ کا لفظ گواہوں کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا جب ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی سے پوچھا: کیا تمہارے پاس بینہ ہے، یا اس خط میں حضرت عمرؓ نے لکھا: بینہ مدعی کے ذمہ ہے، تو ان سب جگہ بینہ سے مراد ہے وہ واضح اور حتمی ثبوت جس سے کسی دعوی یا بیان کی صداقت واضح ہو جائے۔ لہٰذا اس لفظ کے عمومی معنی اور مفہوم کو گواہوں کی کسی طے شدہ تعداد سے محدود کرنا صحیح نہیں۔ گواہی بھی بینہ (واضح ثبوت) کی بہت سے اقسام میں سے ایک ہے۔ بینہ کے ان بہت سے معانی کو ختم کرکے صرف گواہی کے معنی لینے کے بڑے خطرناک نتائج نکلے ہیں اور بہت سے حقداروں کی حق تلفی ہوئی ہے۔ ہر

معاملہ میں گواہوں پر اصرار کرنے اور دیگر ذرائع ثبوت کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ظالم اور حق ناشناس لوگوں کو صرف اس وجہ سے کھل کھیلنے کا موقعہ ملا کہ ان کو یقین تھا کہ ان کی حرکت کی گواہی دینے والے دو گواہ دستیاب نہ ہوں گے۔ اگر بینہ کے قرآنی معنی و مفہوم کو سامنے رکھا جاتا تو یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔

۴۔ "لوگوں (یا مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح، مصالحت یا راضی نامہ جائز ہے، سوائے اس صلح یا راضی نامہ کے جو کسی حرام کو حلال کردے یا کسی حلال کو حرام کردے۔"

یہ اصول ایک حدیث نبوی سے ماخوذ ہے۔ انہی الفاظ میں ایک دوسرے جملہ کے اضافہ کے ساتھ یہ حدیث امام ترمذیؒ اور دوسرے محدثین نے حضرت عمرو بن عوف المزنیؓ کے حوالہ سے روایت کی ہے، وہ زائد جملہ یہ ہے: والمسلمون علی شروطهم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما"[۱۳] مسلمانوں کے مابین جو بھی شرائط طے ہوں وہ باقی رکھی جائیں گی، سوائے ان شرائط کے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی صلح اور مصالحت کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں بین الاقوامی معاملات سے لے کر گھریلو اختلافات تک تمام مسائل کو صلح صفائی، مصالحت اور راضی نامہ سے حل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا صحابہ کرامؓ کے درمیان پیدا ہو جانے والے اختلافات کو صلح اور راضی نامہ سے طے کرایا۔

اسلامی شریعت میں حقوق کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ حقوق اللہ

۲۔ حقوق العباد

حقوق اللہ میں کسی قسم کی صلح یا راضی نامہ کی گنجائش نہیں، مثلاً حدود کا نفاذ، زکوۃ کی ادائیگی اور کفارہ کی ادائیگی وغیرہ کے امور میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ ان معاملات میں بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے صلح کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان حقوق کی انجام دہی میں پوری پوری کوشش کرے اور کسی قسم کی کوتاہی کو دخل نہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً حدود کے معاملات میں اس طرح کے راضی نامے نہیں ہو سکتے، اور جب حدود کے مقدمات عدالت میں دائر ہو جائیں یا حکام (مثلاً پولیس) کے نوٹس میں آجائیں تو پھر سفارش کرنے والے اور سفارش سننے والے دونوں پر خدا کی لعنت برستی ہے۔

اس کے برعکس حقوق العباد میں صلح کی بھی گنجائش ہے، ایک شخص اپنا حق معاف بھی کر سکتا ہے اور اس کا کوئی معاوضہ بھی لے سکتا ہے۔

۱۳۔ جامع ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماذکر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصلح بین الناس

لیکن مصالحت ایسی ہونی چاہئے جو عادلانہ ہو' انصاف پر مبنی ہو' ظلم و زیادتی پر مبنی نہ ہو' خود قرآن مجید کہتا ہے:

فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ (الحجرات ۴۹:۹)

دونوں کے درمیان عدل و انصاف کے مطابق صلح کرادو۔

لیکن اگر یہ مصالحت غیر منصفانہ ہو تو پھر وہ سراسر ظلم ہوگی۔ بہت سے لوگ مصالحت کرتے یا کراتے وقت عدل کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ انداز میں صلح کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات لوگ مصالحت کرتے وقت ایسی شرائط رکھ دیتے ہیں جن کا اثر شریعت کے مقرر کردہ حلال و حرام پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً ایسی شرائط رکھ دی جاتی ہیں جن کی بنیاد سود خوری یا کسی حد شرعی کی موقوفی یا ایسی ہی کسی چیز پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی ہر شرط ظالمانہ سمجھی اور مسترد کردی جائے گی۔ جائز صلح کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایسی شرائط ہوں جن سے اللہ کی رضا بھی حاصل ہو اور بندے بھی خوش ہو جائیں' ایسی صلح ہی عادلانہ' منصفانہ اور مبنی برحق صلح کہلائے گی۔ جو شخص یہ صلح کرائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو واقعہ زیر بحث کی تمام تفصیلات علم ہو' ایسے واقعہ میں کیا کرنا چاہیے اس کو جانتا ہو اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر یہ سب صفات اس شخص میں موجود ہیں تو ایک حدیث مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صلح کرانے والے کو دن روزہ دار و شب زندہ دار سے بہتر قرار دیا ہے ایسے ہی لوگوں کو قرار دیا ہے[۱۴]۔

حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا اخبركم بافضل من درجة الصيام والصلوة والصدقة قالوا بلى قال اصلاح ذات البين وفساد ذات البين الحالقة[۱۵]

کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جو درجے میں روزہ' نماز اور زکوۃ سے بھی افضل ہو۔ لوگوں نے کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں صلح کراؤ۔ آپس کا فساد مونڈ دینے والا ہے یعنی صفایا کردینے والا ہے۔

۵۔ "اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ہے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور و فکر کیا ہے اور تم کو راہ راست کی طرف راہنمائی حاصل ہو گئی ہے محض یہ بات کہ تم کل ایک فیصلہ کر چکے ہو تمہیں ہرگز ہرگز حق کی طرف رجوع کرنے سے باز نہ رکھے۔ اس لئے کہ یاد رکھو حق ایک اٹل حقیقت ہے اس کو کوئی دوسری چیز باطل یا غلط نہیں ٹھہرا سکتی' اور یاد رکھو کہ باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ حق کی طرف رجوع کرلیا جائے۔"

۱۴۔ سنن ابو داود' کتاب الادب' باب فی اصلاح ذات البین۔ مسند احمد بن حنبل (دار الفکر) ۶/۴۴۵

۱۵۔ مسند احمد بن حنبل' دار الفکر ۶/۴۴۵۔ سنن ابو داود' کتاب الادب' باب فی اصلاح ذات البین

یعنی اگر حاکم عدالت اپنے اجتہاد کی روشنی میں آج کوئی فیصلہ کرتا ہے یا کوئی فقیہ اور قانون دان آج کسی فقہی معاملہ میں کوئی رائے قائم کرتا ہے اور کل مزید غور و فکر کرنے سے یا مزید مطالعہ کرنے سے یا کچھ اور نئی معلومات و حقائق سامنے آنے سے وہ اپنی رائے بدل لیتا ہے تو اس کو دوسری رائے پر عمل کرنے میں کسی جھجک، خوف یا شرم کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ مسلمان کی شان ہی یہ ہے کہ جونہی اس کو حق کا علم ہو فوراً اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور سابقہ تمام تعصبات کو جھٹک کر پھینک دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر خود حضرت عمرؓ نے ایک ملتے جلتے معاملہ میں بعد میں جو فیصلہ کیا وہ ان کے ایک سابقہ فیصلہ سے مختلف تھا، اس پر ایک شخص نے کہا: آپ نے فلاں فلاں موقعہ پر تو یہ فیصلہ نہیں کیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

تلک علی ماقضینا یومئذ، وھذہ علی ماقضینا الیوم (۱۶)

وہ معاملہ اس طرح طے ہوا جیسے ہم نے اس وقت فیصلہ کیا تھا اور یہ معاملہ اس طرح طے ہوگا جیسے ہم آج فیصلہ کر رہے ہیں۔

اس طرح حضرت عمرؓ نے سابقہ فیصلہ کو بھی بحال رکھا لیکن اس کو دوسرے فیصلہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

۶۔ "جن معاملات میں قرآن و سنت کی کوئی ہدایت موجود نہیں اور تمہارے دل میں کھٹکتے ہیں ان کے بارے میں خوب غور و فکر اور سمجھ سے کام لو، ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لئے تم پہلے قرآن و سنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کرلو، اس کے بعد جو حل تمہاری رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب، اس کے مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ہو اس کو اختیار کرلو۔"

اس فقرہ کی شرح میں علامہ ابن القیمؒ نے بڑی طویل بحث کی ہے اور حامیان قیاس اور مخالفین قیاس کے دلائل پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ پوری بحث اسلام کے اصول قانون کے اہم باب ماخذ قانون اور نہایت اساسی مہتم بالشان مباحث سے تعلق رکھتی ہے۔

اس عبارت کی شرح میں علامہ ابن القیمؒ نے قیاس کی مشروعیت کے وہ دلائل ذکر کئے ہیں جو علمائے اصول نے قیاس کی تائید میں بیان فرمائے ہیں۔ خود کلام الٰہی میں ایک حقیقت کے اثبات کے لئے اس کو دوسری طے شدہ اور تسلیم شدہ حقیقت پر قیاس کرکے دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کو پہلی زندگی پر اور قبر سے جی اٹھنے کو مردہ زمین کے جی اٹھنے پر قیاس کیا گیا۔ علامہ ابن القیمؒ کے اندازہ کے مطابق اس طرح کے قیاس کی قرآن پاک میں چالیس سے زائد مثالیں ملتی ہیں۔ علمائے اصول نے قیاس کی جو بڑی بڑی قسمیں قرار دی ہیں (مثلاً قیاسِ علت، قیاسِ دلالت، قیاسِ شبہ) ان سب کے نمونے علامہ ابن القیمؒ نے قرآن پاک سے دکھائے ہیں۔

۱۶۔ اعلام الموقعین، جلد اول، فصل قد بتغیر الحکم بتغیر الاجتہاد

قرآن پاک کی ان تو جیہی مثالوں کا یہ نتیجہ تھا کہ فقہائے صحابہؓ نے نہ صرف اپنے زمانہ میں بلکہ خود عہد نبوی میں قیاس واجتہاد سے کام لیا۔ صحابہ کرامؓ کے اس قیاس کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبولیت وپسندیدگی کی سند سے مشرف فرمایا۔علامہ ابن القیمؒ نے "اعلام الموقعین" کی جلد اول میں ایسی بہت سی مثالیں بیان کی ہیں۔

سیدنا عمرفاروقؓ کے اس ارشاد گرامی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قاضی کو چاہیے کہ ایسے تمام معاملات میں جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو خوب غور وفکر سے کام لینے کے بعد ہی فیصلہ کرے۔ایسے معاملات کا فیصلہ محض اندازہ اور ظن وتخمین سے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ پوری تحقیق اور تلاش وجستجو کے بعد رائے قائم کرنی چاہیے۔اس تاکیدی ہدایت سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کو از خود منصب قضاء کے قبول کرنے میں سرگرمی نہیں دکھانی چاہیے۔لیکن اجتہادی صلاحیت رکھنے کے باوجود ایسے مسائل آسکتے ہیں جن کے حل کرنے میں اسے دقت پیش آئے۔اس لئے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں دیئے گئے احکام بہر حال معدود و محدود ہیں جب کہ مسائل وواقعات بے شمار اور لامحدود ہیں۔ایسی صورت میں کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوگا کہ ان محدود احکام میں سے کسی حکم کا کسی واقعہ پر اطلاق وانطباق کرنے میں دقت پیش آئے۔اس دقت کو غور وفکر اور تدبر وتامل ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس تدبر وتامل کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہونے چاہئیں جو اس کو صحیح رخ پر ڈال سکیں۔ایسے ہی ایک قاعدہ کی طرف حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا فقرہ میں اشارہ کیا ہے، یعنی پہلے ان کلیات اور اصول کی معرفت حاصل کرو جن کے تحت قرآن وسنت کے احکام منضبط ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کلیات واصول میں جو اصول وکلیات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، ان کی معرفت اور پہچان حاصل کرو، اس کے بعد تمہارے لئے کام آسان ہو جائے گا اور جب بھی کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگی تم فوراً ان اصول وکلیات اور ان اشباہ ونظائر میں سے کسی کے تحت اس کو لے آؤ گے اور اس کا حکم اس نئی صورت حال پر بھی منطبق کرلو گے۔یہ کام کرنے کے بعد تم دیکھو کہ نئی صورت حال پر کون کون سے اصول و کلیات اور کون کون سے اشباہ ونظائر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ان سب میں جو حکم تمہاری رائے میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب، اس کی مرضی کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ ملتا جلتا معلوم ہو اس کو اختیار کرلو۔یہی قیاس کا بنیادی اصول ہے اور اس پر فقہ اسلامی کے چوتھے اور اہم ماخذ قیاس کی عمارت قائم ہے۔

۷۔ "جو شخص تمہارے سامنے یہ دعوی کرے کہ اس کے اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے، جو وہ اس وقت پیش کرنے سے قاصر ہے تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کر سکے، اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس ثبوت کی بنیاد پر اپنا حق وصول کرلے گا، ورنہ بصورت دیگر تمہارے لئے جائز ہو گا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو۔"

ایسا کرنا دراصل عدل و انصاف کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کے مترادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدعی کے پاس ثبوت ہوتا ہے لیکن فوری طور پر اس کو عدالت میں پیش کرنا مدعی کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اگر جلد بازی میں فیصلہ کیا جائے اور مدعی کو ثبوت پیش کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے تو اس کا حق مجروح ہوگا۔ لہٰذا اگر وہ اس کام کے لئے مہلت طلب کرے تو اس کو مہلت دینی چاہئے۔ اس مہلت کی کوئی متعین مدت مقرر کر دینا مناسب نہیں، بعض فقہاء نے تین دن کی مدت جو تجویز کی ہے وہ بھی ضروری معلوم نہیں ہوتا، بلکہ مقدمہ کی نوعیت کے پیش نظر عدالت خود ہی کوئی مناسب مدت مقرر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر عدالت کو اس کا کسی وجہ سے یقین ہو جائے کہ یہ شخص محض مقدمہ کو طول دینا اور فریق مخالف کو پریشان کرنا چاہتا ہے تو پھر عدالت کو چاہئے کہ ایسے شخص کو کوئی مہلت نہ دے بلکہ فوراً ہی فیصلہ سنا دے۔ اس لئے کہ مہلت دینا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عدل کے تقاضے پورے ہوں، اگر مہلت کی وجہ سے عدل کے تقاضوں کو نقصان پہنچے تو پھر مہلت کی درخواست پر غور نہ کیا جائے۔

۸۔ ''مسلمان سب کے سب عادل ہیں اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ہے، سوائے اس کے جس کو کوئی سزائے حد دی گئی ہو، یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے یا اس (کی جانبداری) کے بارے میں کوئی بدگمانی اس وجہ سے کی جا رہی ہو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ہے۔''

اللہ تعالٰی نے اس امت کو امتِ وسط قرار دیا ہے، اس امت کا کام یہ ہے کہ یہ اپنے قول و فعل سے دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے حق کا عملی نمونہ پیش کرے، وسط کے لفظی معنی ہی ہیں وہ بہترین چیز جو راہ راست پر ہو اور بیچ کی راہ پر عمل پیرا ہو۔ قریب قریب یہی معنی عدل کے بھی ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان امتِ وسط کا رکن ہونے کی وجہ سے عادل ہے، سوائے اس شخص کے جس نے کسی وجہ سے اپنی صفت عدل کو خود مجروح کر لیا ہو۔ مثلاً جھوٹی گواہی دے کر لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہو، ظاہر ہے، جو شخص ایک بار جھوٹی گواہی دے چکا ہو اس کی گواہی پر آئندہ کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جس پر کوئی سزائے حد جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی، اللہ تعالٰی نے ایسے ہی حد جاری شدہ لوگوں کی گواہی قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ اسی طرح جس شخص کے بارے میں یہ بدگمانی کرنے کے مضبوط وجوہ موجود ہوں کہ وہ مشہود لہ (جس کے حق میں گواہی دی جا رہی ہے) سے اس گواہی کے عوض کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

جہاں تک رشتہ داروں کی ایک دوسرے کے حق میں گواہی کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اختلاف ہے، بعض فقہاء اس بناء پر رشتہ داروں کی گواہی کو ہر صورت میں قبول کرنے کی طرف مائل ہیں کہ قرآن مجید یا سنت ثابتہ میں ایسی کوئی صراحت نہیں کہ رشتہ داروں کی گواہی رشتہ داروں کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ یہ رائے امام ابن حزمؒ اور دوسرے ظاہری فقہاء کی ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک (جن میں امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا اور نواسی کے علاوہ بقیہ سب رشتہ داروں کی گواہی ایک دوسرے کے حق میں جائز ہے۔ کچھ دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر کسی رشتہ دار کے بارے میں فریق مخالف کو یہ بدگمانی ہو کہ وہ جانبداری سے کام

لے گا تو پھر اس کی گواہی مسترد کر دی جائے گی اور اگر ایسی کوئی بد گمانی نہ ہو تو پھر رشتہ داروں کی گواہی قابل قبول ہے۔

"یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے۔" اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر ایک شخص ایک بار بھی جھوٹی گواہی کا مرتکب ہو جائے تو اس کی آئندہ کوئی گواہی بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ جھوٹی گواہی کتنا بڑا جرم ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شرک اور جھوٹی بات کو ایک ہی سلسلہ بیان میں ذکر فرمایا ہے۔ اس مضمون کی ایک حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو بہت بڑے بڑے کبیرہ گناہوں کے بارے میں بتاؤں؟ صحابہ کرامؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمایئے، آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، پھر والدین کی نافرمانی کرنا، یہ فرماتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے تشریف فرما تھے، پھر سیدھے ہو کر بیٹھے اور فرمایا: یاد رکھو اور جھوٹی بات! یاد رکھو اور جھوٹ بات، ان الفاظ کو آپ بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ ہمارے دلوں میں خیال آیا کہ کاش اب حضور بس فرمائیں (۱۷)۔

حضرت انسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کیا: سب سے بڑے کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی بے گناہ جان کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی بات کہنا (۱۸)۔

حسن بن زیادؒ اپنے استاذ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک روز محارب بن دثارؒ کی عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دو آدمی آئے، ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف کچھ رقم کا دعویٰ کیا۔ مدعی علیہ نے دعوی کی صحت سے انکار کیا اور مدعی سے ثبوت طلب کیا۔ اس پر ایک شخص آگے بڑھا اور مدعا علیہ کے خلاف گواہی دی۔ مدعا علیہ نے گواہ کا بیان سن کر کہا: نہیں! قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! اس شخص نے میرے خلاف حق کے مطابق سچی گواہی نہیں دی، میں تو اس کو ایک نیک شخص کے طور پر ہی جانتا ہوں، لیکن اس سے یہ لغزش ہو گئی ہے جو اس نے اس ناراضی کی بناء پر کی ہے جو اس کے دل میں میرے خلاف موجود ہے۔ محاربؒ یہ ساری گفتگو تکیہ لگائے سن رہے تھے، یہ آخری بات سن کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے: اے شخص! میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے، فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

> لیأتین علی الناس یوم تشیب فیه الولدان، وتضع الحوامل ما فی بطونها، وتضرب الطیر باذنابها وتضع ما فی بطونها من شدة ذلک الیوم، ولا ذنب علیها وان شاهد

۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین۔

۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین۔

الزور لا یقار قدماہ علی الارض حتی یقذف بہ فی النار

تمام انسانوں پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا' حاملہ عورتوں کے حمل ان کے پیٹوں سے گر جائیں گے' پرندے اپنی دموں اور پروں کو پھڑپھڑاتے ہوں گے اور ان کے پیٹوں میں بھی جو کچھ ہو گا سب باہر آ جائے گا' یہ سب اس دن کی شدت اور سختی کے ڈر سے ہو گا' یہ ان لوگوں کا حال ہو گا جنھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس دن جھوٹا گواہ جب حساب کے لئے پیش ہو گا تو جونہی اس کے قدم زمین پر ٹکیں گے اس کو اٹھا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

پس اگر تو نے سچی گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور اپنی گواہی پر قائم رہ' اور اگر تو نے جھوٹی اور بے بنیاد گواہی دی ہے تو اللہ سے ڈر اور منہ ڈھک کر اس دروازہ سے باہر چلا جا(۱۹)۔

۹۔ "جہاں تک (گواہی کے معاملہ میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی ہے۔"

یعنی جو شخص اپنے ظاہری اطوار و عادات اور عام چال چلن میں اچھا ہو اس کو ہمیں اچھا سمجھنا چاہیے اور اس کی گواہی قبول کر لینی چاہیے۔ اس کے دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے' اگر وہ شخص اپنے دل میں برا ہے تو اللہ اس سے خود نمٹ لے گا۔ جہاں تک معاملات دنیا کا (اور بالخصوص عدالتی معاملات کا) تعلق ہے تو اس کا فیصلہ لوگوں کے باطن پر نہیں بلکہ ظاہر پر ہوتا ہے۔ ان معاملات میں لوگوں کا ظاہر اصل ہے اور باطن اس کے تابع ہے' لیکن جب آخرت میں اصل فیصلہ ہو گا تو لوگوں کا باطن اصل ہو گا اور ظاہر اس کے تابع ہو گا۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ عراق کے بعض فقہاء مثلاً امام ابو حنیفہؒ نے حضرت عمرؓ کے اس قول کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہر اس مسلمان کی گواہی قبول کر لی جائے جس میں کوئی شک والی بات نہ ہو' چاہے وہ کتنا ہی انجان اور نامعلوم ہو۔ لیکن حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہمارے (علامہ ابن القیمؒ کے) خیال میں یہ مطلب نہیں نکلتا' خود حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ اسلام میں کسی شخص کو برے گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا' اس لئے کہ ہم سب صرف عادل گواہوں کو قبول کرتے ہیں' یہاں حضرت عمرؓ نے مثبت طور پر عادل گواہ کی گواہی کو قبول کرنے کا ذکر کیا ہے' اس سے عراق کے ان فقہاء کی رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

۱۹۔ اعلام الموقعین' جلد اول' فصل الکذب من الکبائر

عہد فاروقی کی اس تاریخ ساز دستاویز سے جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سامنے وہ تمام بنیادی مسائل واضح اور منقح طور پر موجود تھے جن کی بنیاد پر اصول فقہ کی عظیم الشان عمارت وجود میں آئی۔ اس دستاویز میں (جو اصلاً قانون ضابطہ و مرافعات یعنی پروسیجرل لاء کے مسائل سے بحث کرتی ہے) ایسے اہم مسائل کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو اصول فقہ کے مسائل ہیں۔ چنانچہ حق، نظیر، قیاس اور اشباہ ونظائر جیسے اہم اصولی مباحث کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بابرکت دور میں اٹھنے والے یہی وہ اصولی مسائل تھے جن کی بنیادیں ہمیں اس دستاویز میں ملتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کا مبارک زمانہ ان بحثوں کی مزید پختگی کا زمانہ ہے۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں یہ تصورات اتنے واضح اور پختہ ہو چکے تھے کہ اب ان پر باقاعدہ تحریریں سامنے آنے لگیں۔ آئندہ صفحات میں اصول فقہ کی انہی تحریروں اور کتابوں کا مختصر تعارف مقصود ہے۔

ان تحریروں کے تعارف سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیگر قوانین کے برعکس اسلامی قانون کی تاریخ میں فقہی جزئیات اور اصولی قواعد دونوں ایک ساتھ ہی سامنے آئے۔ صحابہ کرامؓ نے جہاں اجتہاد کے ذریعہ بہت سی نئی فقہی جزئیات دریافت کیں وہاں انھوں نے بہت سے اصولی قواعد و احکام کا بھی پتا لگایا۔ اجتہاد کے بنیادی تصور ہی میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ اجتہاد کے عمل کو انجام دینے کے لئے کچھ قواعد و ضوابط بھی ہوں اور اس کا اسلوب اور منہاج بھی ہو جس کی مجتہد پیروی کرے۔ لہٰذا جب سے اجتہاد کا عمل جاری ہے اس وقت سے ہی اجتہاد کے کچھ نہ کچھ ضوابط بھی موجود ہیں اور کوئی نہ کوئی منہاج بھی موجود ہے۔ اوپر دور صحابہؓ میں بعض اصولی تصورات و احکام کی مثالیں دی گئی ہیں جن سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اجتہادات کی پشت پر باضابطہ اصولی قواعد موجود تھے جن کی پیروی صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے ہو رہی ہے۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یہ دائرہ پھیل گیا۔ علقمہؒ اور ابراہیم نخعیؒ جیسے نامور فقہاء اور قاضی شریحؒ اور قاضی ایاس بن معاویہؒ جیسے جلیل القدر قانون ساز منصفوں کے اجتہادات کے نتیجہ میں روز روز نت نئے اصول سامنے آتے گئے اور اجتہاد و اجماع کے کئی اسالیب اور مناہج پیدا ہوتے گئے۔

امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالہ"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس گفتگو کا آغاز اصول فقہ اور اصول قانون کے موضوع پر اولین اور قدیم ترین دستیاب کتاب سے کیا جائے۔ امام محمد بن ادریس الشافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کی کتاب "الرسالہ" بلا شبہ اس موضوع پر قدیم ترین اور اولین دستیاب باقاعدہ تصنیف

ہے۔ اس کتاب میں امام شافعیؒ نے ان اصولی مسائل پر جو پہلی صدی ہجری کے اواخر پر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں دنیائے اسلام میں زیر بحث تھے ایک جامع اور متوازن نقطہ نظر پیش کیا۔ امام شافعیؒ کا مرتب کردہ یہ نقطہ نظر (FORMULATION) جمہور اہل سنت اور امت کے معتمد اہل علم کے دل کی آواز تھا۔ کچھ اس کے مضامین کی جامعیت، کچھ اس میں بیان کردہ آراء اور نظریات کا اعتدال اور کچھ اس کے جلیل القدر مصنف کی عظیم شخصیت کا اثر، ان سب چیزوں نے مل کر کتاب "الرسالہ" کو دنیائے اسلام میں ہر جگہ مقبول و متعارف کرا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ کتاب اصول قانون کی تاریخ میں دنیا کی اولین اور ایک بہت مقبول اور اہم کتاب کے طور پر پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں، بشمول اردو اور انگریزی میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔

دوسری صدی ہجری کا زمانہ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے، خاص طور پر اس صدی کا نصف آخر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی علوم و فنون کی تدوین و تشکیل کا عمل زور شور سے جاری تھا، تیزی سے پھیلتی ہوئی اسلامی ریاست اور بڑھتی ہوئی امت مسلمہ کے نت نئے مسائل کا حل سوچا جا رہا تھا، اسلام میں نئے نئے داخل ہونے والے ایرانی، مصری، ترک، عراقی، ہندوستانی، بربر اور دوسرے لوگ اپنے اپنے مقامی حالات اور رسوم و رواجات کے بارے میں اسلام کا موقف معلوم کر رہے تھے اور مختلف تہذیبی اور فکری پس منظر رکھنے والے اہل دانش طرح طرح کے سوالات اٹھا رہے تھے اور دنیائے اسلام کے علمی حلقوں میں ان کے جوابات پر غور کیا جا رہا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب بعض لوگوں نے جن میں دوسری تہذیبوں کا پس منظر رکھنے والے چند نو مسلم پیش پیش تھے سنت کی تشریعی حیثیت، قرآن کی تعبیر و تشریح کے اصولوں، اجماع کی آئینی حیثیت، قوانین کے نفاذ میں تدریج، نسخ اور تخصیص جیسے امور کے بارہ میں بعض شبہات اور تحفظات کا اظہار کیا۔ ان شبہات کے جواب میں فقہاء اور محدثین نے اپنے اپنے انداز میں امت کا موقف پیش کیا اور تحریری اور زبانی دونوں طرح سے پوچھنے والوں کو مطمئن کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ، امام مالکؒ، امام لیث بن سعدؒ، امام محمد بن الباقرؒ اور امام جعفر صادقؒ نے مختلف اوقات میں اصول فقہ سے متعلق اہم مسائل و معاملات پر تحریریں مرتب کیں۔ لیکن یہ تحریریں یا تو اصول فقہ کے جزوی مسائل سے متعلق کسی سوال کا جواب تھیں، یا وہ کسی وجہ سے باقاعدہ اور مقبول و متعارف تصنیف کی حیثیت اختیار نہ کر سکیں۔ ان حالات میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان سب مسائل کے بارہ میں ایک جامع اور مرتب و مربوط کتاب تیار کی جائے جس میں ان تمام سوالات کا واضح اور ٹھیک ٹھیک جواب دیا گیا ہو۔ چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر امام عبدالرحمن بن مہدیؒ (م ۱۹۸ھ) نے امام شافعیؒ سے درخواست کی کہ وہ تفسیر و تعبیر قرآن، حجیت حدیث، حجیت

اجماع اور ناسخ و منسوخ جیسے مسائل پر ایک کتاب مرتب کریں۔ اس درخواست کے جواب میں امام شافعیؒ نے یہ کتاب مرتب کی جو "الرسالہ" یا "کتاب الرسالہ" کے نام سے چار دانگ عالم میں معروف، مقبول اور متداول ہے اور جو اصول فقہ کی وہ پہلی باقاعدہ اور مربوط تصنیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ امام شافعیؒ نے پہلی بار یہ کتاب ۱۸۴۔۱۸۵ھ کے لگ بھگ مرتب کی۔ بعد میں اپنی زندگی کے آخری سالوں میں جب ان کا قیام مصر میں تھا تو انھوں نے اس میں مزید ترمیم و اضافے کئے اور اس کو موجودہ شکل دی۔

امام شافعیؒ نے "الرسالہ" میں جن اہم اور بنیادی مسائل سے بحث کی ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ بعثت نبوی کے وقت کون کون سے مذہبی رویے پائے جاتے تھے اور لوگوں نے کس کس قسم کی گمراہیاں اختیار کر رکھی تھیں؟ قرآن مجید ان گمراہیوں سے نکلنے کا کیا راستہ بتاتا ہے؟ یہاں امام شافعیؒ ان آیات کا حوالہ دیتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہر چیز کا واضح بیان ہیں۔

۲۔ بیان سے کیا مراد ہے اور بیان کی کیا کیا ممکنہ صورتیں ہیں؟ قرآن مجید کس طرح اور کس مفہوم میں لوگوں کے معاملات و مسائل کا بیان ہے۔ قرآن میں کون کون سے احکام، کون کون سے فرائض اور کون کون سے واجبات بتائے گئے ہیں۔ پھر جن احکام اور اصول و فرائض کا قرآن میں ذکر ہے ان کی وضاحت اور بیان کے لئے قرآن میں کیا کیا اسلوب اختیار کئے گئے ہیں۔ قرآن کے ذریعہ بیان احکام اور سنت کے ذریعہ بیان احکام میں کیا فرق ہے؟ قرآن و سنت کی تبیین و تشریح میں عربی زبان، عربی اسلوب اور عربی محاورہ کی کیا اہمیت ہے، گویا قانون اور زبان و لغت کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

۳۔ تعبیر نصوص میں عام اور خاص الفاظ کا مفہوم اور مقصود کیسے متعین کیا جائے گا؟ کن حالات میں عام کو خاص کے مفہوم میں اور خاص کو عام کے مفہوم میں لیا جائے گا۔ ان مباحث کے ذریعہ گویا امام شافعیؒ نے علم تعبیر قانون (PRINCIPLES OF INTERPRETATION) کو مرتب کرنے کی طرف پہلا باضابطہ قدم بڑھایا۔

۴۔ کسی حکم یا نص کو سمجھنے میں اس کے سیاق و سباق کی کیا اہمیت ہے؟

۵۔ قرآن کے احکام کی تفسیر و تعبیر اور تخصیص و تشریح میں سنت کا کردار کیا ہے؟ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واجب التعمیل ہونا قرآن سے واضح ہے اور اللہ کی اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اطاعت کے ذریعہ ممکن ہے۔

۶۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قسم کے احکام ثابت ہوتے ہیں اور ان کا قرآن مجید سے کیا ربط ہے۔

۷۔ احکام شریعت میں نسخ سے کیا مراد ہے۔ ناسخ اور منسوخ کا تعین کن امور سے کیا جائے گا؟ کیا قرآن کے کسی حکم کو سنت کے

ذریعہ منسوخ کیا جا سکتا ہے؟ کیا اجماع کے ذریعہ کوئی حکم منسوخ ہو سکتا ہے؟

۸- قرآن کے وہ عمومی احکام جن کی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تخصیص کی گئی۔

۹- سنت رسول میں دیئے گئے احکام کی قسمیں اور قرآن سے ان کا تعلق۔

۱۰- قرآن و سنت کی جن نصوص میں بظاہر تعارض اور اختلاف معلوم ہوتا ہے ان کے باہمی تعارض کو کیسے دور کیا جائے۔ یہ کتاب کا نسبتاً سب سے مفصل اور طویل حصہ ہے۔

۱۱- اشباہ و فروق، یعنی وہ احکام جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور وہ احکام جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۲- قرآن و سنت کے احکام میں نہی کا مفہوم کیا ہے؟ اور نہی کی کتنی قسمیں ہیں۔

۱۳- علم شریعت کے تین درجے، ایک لازمی درجہ جس کا جاننا سب کے لئے ضروری ہے اور دوسرا تفصیلی اور تحقیقی درجہ جو اہل علم کے ساتھ خاص ہے۔ تیسرا درجہ خاص خاص اہل علم کے لئے مخصوص ہے۔

۱۴- خبر واحد کی قانونی اور تشریعی حیثیت اور اس کی شرائط۔ کن حالات میں خبر واحد قابل قبول ہوگی اور کن حالات میں اس کی تاویل کی جائے گی۔

۱۵- خبر واحد اور شہادت کے مابین فرق اور اس کے اسباب و وجوہات۔

۱۶- خبر واحد کے واجب التعمیل ہونے کے دلائل۔ یہ حصہ بھی اس کتاب کے نہایت مہتم بالشان مباحث پر مشتمل ہے۔ یہاں امام شافعیؒ نے خبر واحد کے واجب التعمیل ہونے پر بہت سے عقلی اور نقلی دلائل دیئے ہیں۔

۱۷- اجماع کی شرعی حیثیت۔

۱۸- قیاس اور اس کی حجیت۔ قیاس اور اجتہاد ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ قیاس اور اجتہاد کی حجیت کے دلائل۔

۱۹- استحسان کی تردید۔

۲۰- مختلف اجتہادات کی صورت میں کیا حل اختیار کیا جائے۔

۲۱- اقوال صحابہؓ کا مقام اور مصادر احکام میں ان کی حیثیت۔

۲۲- اجماع اور قیاس کا درجہ اور کتاب و سنت کے احکام میں اس کی حیثیت۔

عنوانات و مباحث کے اس جائزہ سے اندازہ ہو گا کہ امام شافعیؒ نے اصول فقہ کے لئے جو رجحان طے کیا تھا وہ آنے والوں کے لئے

ایک نمونہ بنا جس کو بیشتر مصنفین نے اپنایا۔ انھوں نے "الرسالہ" میں جن مباحث کو اصول فقہ کے بنیادی مباحث قرار دیا تھا بعد والوں نے بھی ان مباحث کو اصول فقہ میں بنیادی حیثیت دی۔ امام شافعیؒ نے اصول فقہ کے مضامین پر گفتگو کرنے کا جو اسلوب اختیار کیا تھا۔ بعد میں آنے والوں نے اسی کی پیروی کی۔ گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال میں اصول فقہ کی کوئی قابل ذکر کتاب ان مباحث سے صرف نظر نہیں کر سکی جو امام شافعیؒ نے دوسری صدی ہجری کے اواخر میں اٹھائے تھے۔ اس سے علم اصول فقہ کی تشکیل و ارتقاء پر امام شافعیؒ کے غیر معمولی اور دائمی اثرات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ امام صاحب کے ان اثرات کا اصول فقہ پر لکھنے والوں نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ کچھ مصنفین یہ اعتراف صراحتاً کرتے ہیں اور کچھ اشارتاً۔ اعتراف کی ایک بالواسطہ شکل یہ ہے کہ آج تک اصول فقہ کے علماء امام شافعیؒ کے طرز استدلال اور اسلوب کی پیروی کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ کو بجا طور پر مسلم مورخین نے اصول فقہ کا بانی اور غیر مسلم مورخین نے اصول فقہ کا عظیم معمار (MASTER ARCHITECT) اور GREAT SYSTEMATIZER قرار دیا ہے۔

امام فخرالدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کو اصول فقہ سے وہی نسبت ہے جو حکیم ارسطاطالیس کو منطق سے اور خلیل ابن احمدؒ (م ۱۷۰ھ) کو علم عروض سے ہے۔ ارسطو سے قبل لوگ منطقی اسلوب اور عقلی استدلال کے اصولوں سے کام لیتے تھے اور اس سلسلہ میں بعض قواعد اور اصولوں کی آپ سے آپ پابندی کرتے تھے۔ لیکن یہ اصول مرتب اور مدون نہ تھے۔ ارسطو نے ان سب کو اس طرح مرتب کر دیا کہ آج تک دنیائے عقلیات ارسطو کی احسان مند چلی آرہی ہے۔ اسی طرح خلیل بن احمدؒ سے قبل لوگ شاعری کرتے تھے اور اپنی موزونی طبع سے کام لے کر وزن و قافیہ وغیرہ کے تقاضوں کی آپ سے آپ پیروی کرتے تھے۔ خلیلؒ نے ان اصولوں کو اس طرح مرتب اور مدون کر دیا کہ وہ اور علم عروض لازم و ملزوم ہو گئے۔ یہی کیفیت امام شافعیؒ کے کام کی ہے۔ ان سے قبل صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے دور کے لوگ اجتہاد کرتے چلے آرہے تھے، قرآن و سنت سے احکام کا استنباط کر رہے تھے اور اس ضمن میں بعض طے شدہ اور معروف اصولوں کا فطری طور پر لحاظ رکھتے تھے۔ امام شافعیؒ نے ان سب اصولوں کو اس طرح مرتب کر دیا کہ آج دنیائے اصول کو امام شافعیؒ کا احسان تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

امام شافعیؒ کی اس کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دور میں منطقی اسلوب اور عقلی استدلال کس قدر پختگی کو پہنچ چکا تھا۔ مسلمانوں میں یونانیوں کی استخراجی منطق کی درآمد تو بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بہت پہلے امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کی تحریروں میں قرآنی اسلوب استدلال کی بنیاد پر استقرائی منطق سے استفادہ کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں، "کتاب الرسالہ" میں علم اصول فقہ کے ساتھ ساتھ ماورائے اصول فقہ یعنی META JURISPRUDENCE کے مباحث کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ علم کی تعریف، حق اور

باطل کی اساس ' حقیقت ظاہری اور حقیقت باطن کی بحث' اور ایسے دوسرے مسائل دراصل ماورائے اصول فقہ ہی کے مباحث ومسائل ہیں۔

امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالہ" نہ صرف شافعی فقہاء کے ہاں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں ہمیشہ ایک مقبول اور معروف کتاب رہی۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ اس کے ترجمے متعدد زبانوں میں کیئے گئے۔ ہماری اردو زبان بھی "کتاب الرسالہ" کے ترجمہ سے محروم نہیں رہی۔ "الرسالہ" کی شرحوں میں امام ابو بکر محمد بن عبداللہ الصیرفیؒ (م ۳۳۰ھ)' امام ابو الولید نیشاپوریؒ (م ۳۴۹ھ)' امام قفالؒ (م ۳۶۵ھ) اور امام محمد الجوینیؒ (م ۴۳۸ھ) کی شرحیں قدیم بھی ہیں اور معروف بھی۔ لیکن افسوس کہ ان کا ذکر صرف تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں تک محدود ہے' آج ان کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں۔

اصولِ فقہ کے اسالیب ومناہج

قبل ازیں اصول فقہ کی ابتدائی تاریخ کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ اصولی مباحث پر دوسری ہجری کے اوائل ہی سے تالیفات اور تحریری کاوشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ نے رائے' استنباط' اجتہاد اور استحسان جیسے اہم اصولی مسائل و مباحث پر تحریریں مرتب کیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے بارہ میں روایت ہے کہ انھوں نے "کتاب الرائے" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی۔ جس کو بعض مورخین نے اصول فقہ کی پہلی باقاعدہ کتاب قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام صاحب کے نامور شاگرد امام محمد ابن الحسن الشیبانیؒ نے کتاب اجتہاد الرای' کتاب الاستحسان اور کتاب اصول الفقہ کے نام سے تین کتابیں مرتب کیں۔ امام مالکؒ نے قیاس اور خبر واحد' اجماع اور عمل اہل مدینہ اور اختلاف فقہاء جیسے خالص اصولی مسائل پر' امام لیث بن سعدؒ نے انہی مسائل پر امام مالکؒ کے جواب میں اور شیعہ مورخین کے بقول امام باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ نے بعض اہم اصولی مسائل پر تحریری کاوشیں چھوڑیں۔ ان تحریری کاوشوں میں سے آج صرف امام مالکؒ اور امام لیث بن سعدؒ کی تحریریں موجود ہیں۔ بقیہ تمام تحریریں آج ناپید ہیں۔ بعد میں دوسری صدی ہجری کے اواخر میں امام شافعیؒ نے اپنا وہ شہرہ آفاق رسالہ لکھا جس کو اللہ تعالٰی نے بقائے دوام کی دولت اور شہرت عام کی عزت سے نوازا۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا گیا' یہی وہ کتاب تھی جس نے امام شافعیؒ کو بلا شبہ علم اصول قانون کے مدون اولین کے طور پر دنیائے قانون کی تاریخ میں سب سے نمایاں مقام عطا کیا۔

ان تمام تحریری کاوشوں میں نسبتاً زیادہ دیرپا اثرات امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی تحریروں کے ہوئے جن کے تلامذہ اور متبعین نے ان کے اسلوب کو آگے بڑھایا اور یوں جلد ہی دو نمایاں اور منفرد اسلوب سامنے آگئے۔ ایک اسلوب احناف کا اسلوب (طریقہ احناف)

ہے جس کو طریقہ فقہاء بھی کہا جاتا ہے- یہ اسلوب استقرائی انداز کا ہے، یعنی اس میں فقہی جزئیات کا مطالعہ کر کے ان کی پشت پر کار فرما کلیات دریافت کئے جاتے ہیں- دوسرا اسلوب امام شافعیؒ اور ان کے متبعین کا ہے جس کو طریقہ شافعیہ یا طریقہ متکلمین بھی کہا جاتا ہے- یہ اسلوب کتاب الرسالہ اور امام شافعیؒ کی دوسری تحریروں سے متاثر ہے- اس کا انداز عموماً "استخراجی نوعیت کا ہے، یعنی اس میں پہلے اصول وضع کئے جاتے ہیں اور بعد میں ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات کا جائزہ لیا جاتا ہے- گویا پہلا اسلوب عملی انداز کا اور دوسرا اسلوب نظری انداز کا ہے-

یہ دونوں اسلوب دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل سے واضح اور نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے اور تقریباً تین ساڑھے تین سو سال تک ایک دوسرے کے متوازی ترقی کرتے رہے- چھٹی صدی ہجری کے وسط سے یہ دونوں اسلوب ایک دوسرے کے قریب آنا شروع ہوئے اور یوں ایک تیسرے اسلوب نے جنم لینا شروع کیا جو ان دونوں کا مجموعہ بلکہ امتزاج تھا- اس تیسرے اسلوب کا مقصد پہلے دونوں اسلوبوں کی خوبیوں کو ایک جگہ سمونا اور پچھلے تمام اصولیین کی فکری کاوشوں کو یکجا کر کے ان میں ایک امتزاج پیدا کرنا تھا-

ذیل میں ان تینوں اسالیب کا قدرے مفصل تعارف اور ان کے نمائندہ مصنفین کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے:

اسلوبِ فقہاء

پہلا اسلوب جو طریقہ فقہاء یا طریقہ احناف کہلاتا ہے تاریخی طور پر پہلے سامنے آیا- اس کی بنیاد امام ابو حنیفہؒ کے اقوال و اجتہادات اور امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کی تاریخ ساز تصانیف تھیں- امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ نے اپنے اجتہادات سے جو فقہی احکام مرتب کئے تھے وہ اکثر و بیشتر امام محمد شیبانیؒ کی کتابوں میں مدون ہیں- ان اجتہادات کی تعداد ہزاروں اور بعض مورخین کے بقول لاکھوں میں ہے- قدیم حنفی مورخین فقہ کی روایت کے بموجب امام ابو حنیفہؒ نے تراسی ہزار مسائل میں اجتہاد کیا اور کم و بیش پانچ لاکھ فروعی احکام مرتب کرائے-

بعد میں آنے والے حنفی فقہاء نے ان مسائل اور فروعی احکام پر غور کر کے یہ پتا چلایا کہ ان کے ائمہ نے کن اصولوں اور قواعد کو سامنے رکھ کر یہ احکام مرتب کئے تھے- جوں جوں ان فروعی مسائل پر غور و خوض ہوتا گیا ان کی پشت پر کار فرما اصول و قواعد بھی واضح ہوتے چلے گئے، اور یوں علم اصول فقہ کا وہ اسلوب منقح ہوتا گیا جو طریقہ احناف کہلاتا ہے- اس پورے اسلوب میں توجہ کا مرکز ائمہ احناف کے اجتہادات رہے جن پر جوں جوں غور و فکر ہوتا گیا اس کے ذریعہ اصول فقہ کا فن مرتب ہوتا گیا- اس اسلوب کی پیروی کی وجہ سے اس کے بعض مصنفین کے ہاں یہ رجحان پرورش پا گیا کہ اصول اس طرح اور ایسے مرتب کرنے کی کوشش کی جائے جن سے ان کے ائمہ کے

اجتہادات حق بجانب قرار پا سکیں۔ یہ رجحان چند ایک مصنفین کے ہاں تو بڑا واضح اور کچھ کے ہاں بہت ہلکا اور دھندلا ہے۔

احناف کے اسلوب پر لکھی جانے والی مفصل اور باقاعدہ تصانیف میں سب سے اولین کتاب امام ابو بکر جصاصؒ (م ۳۷۰ھ) کی کتاب "اصول الجصاص" ہے۔ امام جصاصؒ کی یہ کتاب جس کا اصل نام کتاب "الفصول فی الاصول" ہے نہ صرف طریقہ احناف پر لکھی جانے والی اصول فقہ کی پہلی مبسوط کتاب ہے بلکہ تاریخ قانون میں اصول فقہ کے موضوع پر سب سے پہلی مفصل اور جامع کتاب ہے۔ اصول فقہ پر اس سے قبل کی تحریروں میں کوئی تحریر اتنی مبسوط، مفصل اور جامع نہیں ہے۔ اس کتاب نے نہ صرف طریقہ احناف یا طریقہ فقہاء کو باقاعدہ طور پر مدون کر کے پیش کیا بلکہ بعد میں آنے والوں کے لئے راستہ اور اسلوب بھی متعین کر دیا۔ یوں یہ کتاب اصول فقہ کی ابتدائی تاریخ میں ایک رجحان ساز (TREND SETTER) کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام جصاصؒ نے اس کتاب میں حنفی اسلوب کے مطابق اصول فقہ کی جو بنیادیں مقرر کیں اور جو اصول مرتب کئے ان کی بعد میں سینکڑوں سال تک پیروی کی گئی۔ امام جصاصؒ کی اس کتاب کو ایک نمایاں امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ کوئی خالص نظری کاوش نہیں رہی بلکہ اس کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں بیان کردہ اصولوں کو اپنی ایک اور عالمانہ تصنیف اور ایک دوسری رجحان ساز کتاب "احکام القرآن" میں منطبق کر کے دکھایا۔ امام جصاصؒ نے بعض اہم مسائل کے بارہ میں جو آراء بیان کیں وہ بعد کے کئی سو سال تک علمائے اصول کے خیالات کو ڈھالنے میں موثر ثابت ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے نسخ کی جو تعریف کی وہ ایک مصری فاضل ڈاکٹر مصطفیٰ زید کے بقول پانچ سو سال تک مقبول اور متداول رہی۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف حنفی اصول فقہ کی تاریخ میں بلکہ اصول فقہ کی عمومی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔

امام جصاصؒ نے اس کتاب میں اصول فقہ کے ان تمام بنیادی مسائل سے بحث کی ہے جو اس وقت تک (چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر تک) سامنے آ چکے تھے اور جن پر اس دور کے فقہاء اور اصولیین کے درمیان بحث و تمحیص جاری تھی۔ ان مسائل میں اصول تعبیر و تفسیر (دلالات یا رولز آف انٹرپریٹیشن)، حکم شرعی کی اقسام، ناسخ و منسوخ، ماخذ قانون، بالخصوص سنت، اجماع اور قیاس، قیاس کے طریقے، علّتِ احکام (RATIO DECIDENDI)، استحسان (یعنی ایکویٹی کا اسلامی متبادل) اور اجتہاد شامل ہیں۔ ان بنیادی مسائل پر امام جصاصؒ نے جو بحثیں کی ہیں وہ اپنی جامعیت، تعمق اور سلاست بیان میں ممتاز ہیں۔ اس کتاب کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے بیان کردہ ہر اصول اور قاعدہ کو قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبویہ پر منطبق کر کے دکھایا ہے۔ اس طرح اس کتاب کے مطالعہ سے علم اصول کے طلبہ کو اس بات کی مشق ہو جاتی ہے کہ اصول فقہ کے احکام اور قواعد کو خود عملاً برت کر دیکھ سکیں اور ان کی مدد سے قرآن و سنت سے نئے شرعی احکام کا استنباط کر سکیں۔

بعض جدید محققین کا خیال ہے کہ امام جصاصؒ کی یہ کتاب امام شافعیؒ کی "الرسالہ" کے اسلوب سے متاثر ہے۔ اس میں نہ صرف موضوعات کا انتخاب بلکہ ان کی عمومی ترتیب بھی کم و بیش وہی ہے جو امام شافعیؒ نے "الرسالہ" میں اختیار کی تھی۔ مزید برآں اصولوں کی عملی تطبیق کا جو انداز امام شافعیؒ کے ہاں ملتا ہے وہی اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ اس خیال کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اس کتاب میں جا بجا امام جصاصؒ نے امام شافعیؒ کے نقطہ نظر پر تبصرہ کیا ہے اور ان کے دلائل کا محاکمہ کر کے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ بعض مقامات پر جہاں امام شافعیؒ نے اہل الرائے (جن میں احناف بھی شامل سمجھے جاتے تھے) کے خیالات پر تنقید کی تھی وہاں امام جصاصؒ نے جوابی تنقید کی ہے اور امام شافعیؒ کے نقطہ نظر کی کمزوریاں بیان کی ہیں۔

اصول الجصاص کے بعد احناف کی جس کتاب نے اصول فقہ کے ارتقاء پر گہرا اثر ڈالا وہ فخر الاسلام بزدویؒ (م ۴۸۲ھ) کی "کنز الوصول" ہے۔ فخر الاسلام بزدویؒ کی کتاب "کنز الوصول الی معرفۃ الاصول" جو عام طور پر "اصول البزدوی" کے نام سے معروف ہے طریقہ احناف کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ مقبولیت کے اعتبار سے اس کا درجہ "اصول الجصاص" سے بلند ہے۔ کتاب کے مصنف علامہ بزدویؒ اپنے زمانہ کے نامور ترین حنفی فقہاء میں سے تھے اور فقہ اور اصول کے موضوعات پر ان کی بلند پایہ کتابیں ان کے اپنے زمانہ ہی سے مقبول و معروف تھیں۔ اصول فقہ پر ان کی یہ بلند پایہ کتاب اپنے روز تالیف ہی سے اپنے موضوع پر ایک بنیادی اور اہم کتاب قرار دی گئی۔ درس و تدریس، تحقیق و افتاء اور تصنیف و تالیف کے حلقوں میں اس کتاب کی بنیاد پر بہت سا علمی کام کیا گیا۔ اس کی شرحیں اور حواشی لکھے گئے، اس کی تلخیصیں تیار ہوئیں اور اس میں بیان کردہ احادیث کی تخریج کی گئی۔ اس کتاب پر لکھی جانے والی کتابوں اور اس کی شرحوں میں غالباً سب سے زیادہ مشہور علامہ عبدالعزیز بخاریؒ (م ۷۰۴ھ) کی کتاب "کشف الاسرار" ہے جو بارہا دنیائے عرب اور برصغیر وغیرہ میں چھپی ہے اور اصول فقہ کی اعلیٰ درسی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

فخر الاسلام بزدویؒ کی یہ کتاب حنفی اصول فقہ کے اس مرحلہ کی نمائندگی کرتی ہے جب احناف کے ہاں اصول فقہ کے قواعد و احکام اور بنیادی تصورات اچھی طرح واضح اور منقح ہو چکے تھے اور اصول فقہ کا علم اپنے عروج و کمال کے ایک درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ علامہ بزدویؒ سے قبل حنفی علمائے اصول نے جو جو بحثیں اٹھائی تھیں اور جو جو فکری جولانیاں دکھائی تھیں ان سب کو فخر الاسلامؒ نے اپنی کتاب میں اچھی طرح سمو لیا ہے۔ انھوں نے اب تک کئے جانے والے کام کی چھان پھٹک کر کے جن اصولوں پر حنفی حلقوں میں اتفاق رائے ہو چکا تھا ان کو نہایت جامع، مرتب اور منضبط انداز میں پیش کیا۔ گویا یہ کتاب پانچویں صدی ہجری کے اواخر تک حنفی اصول فقہ میں ہونے والی ترقی اور وسعت اور قانونی تفکیر کا سب سے عمدہ نمونہ ہے۔ اس کتاب کے زمانہ تک آتے آتے خود علمائے احناف کے ہاں بعض معاملات پر

ایک سے زائد آراء سامنے آ گئی تھیں۔ فخر الاسلام بزدویؒ نے ان آراء کا بھی جائزہ لیا اور محاکمہ کر کے ان میں سے جو رائے ان کے نزدیک صحیح تر اور قوی تر تھی اس کی نشان دہی بھی کی اور دلائل سے اپنے نقطہ نظر کی تائید کی۔ علامہ بزدویؒ کے ان مباحث نے بعد میں آنے والے حنفی علمائے اصول کی آراء پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور بعد میں آنے والوں نے ان کی بہت سی تحقیقات کو قبول کیا۔

"کنز الوصول الی معرفۃ الاصول" کی ترتیب مباحث و موضوعات کم و بیش وہی ہے جو احناف کی بقیہ کتابوں میں عموماً" اور اصول الجصاص میں خصوصاً" اختیار کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز ایک مختصر مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں علم (یعنی علم دین) کی انواع و اقسام سے بحث کی گئی ہے اور علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ علم توحید و صفات، یعنی علم عقائد اور تزکیہ و احسان

۲۔ علم شریعت و احکام، یعنی علم اصول و فروع فقہ

پہلے علم کی بنیاد سے بحث کی ہے اور علم کی حقیقت کا ذکر کرنے کے بعد بتایا ہے کہ دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کا راز براہ راست قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے تمسک، خواہشات نفسانی اور بدعات و خرافات سے اجتناب اور صحابہ کرامؓ تابعین اور سلف صالحین کے طریقہ پر قائم رہنے میں پنہاں ہے۔ یہ وہی علم ہے جس میں امام ابو حنیفہؒ نے "الفقہ الاکبر" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں امام صاحب نے توحید و صفات اور عقائد کی تفصیلات سے بحث کی ہے۔ دوسرا شعبہ علم فقہی احکام کی تفصیلات سے بحث کرتا ہے۔ اس کی علامہ بزدویؒ کے نزدیک تین شاخیں یا شعبے ہیں۔ پہلا شعبہ خود ان احکام کا ہے جن پر عمل درآمد کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ دوسرا شعبہ ان احکام کی گہری اور حقیقی معرفت ہے، جس کے ذریعہ نصوص کی تعبیر و تفسیر اور اصول و فروع کے باہمی ربط کا پتا چلتا ہے۔ تیسرا شعبہ احکام شرعیہ پر عملدرآمد اور اس کا طریقہ کار ہے۔ عمل درآمد اور احکام کی تعمیل کا علم اس لئے ضروری ہے کہ اسلام میں علم برائے علم مقصود نہیں ہے۔

علم دین کے ان شعبوں کے ذکر کے بعد علامہ بزدویؒ نے سب سے پہلے چار بنیادی مصادر فقہ یا ماخذ شریعت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے بیان کرنے کا انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں: جاننا چاہئے کہ شریعت کے اصول (مصادر) تین ہیں: کتاب اللہ، سنت، اجماع۔ اور چوتھی اصل (مصدر) وہ قیاس ہے جو ان تین اصولوں سے اخذ کئے ہوئے معانی پر مبنی ہو۔ اس اسلوب کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع تو فی نفسہ اور مستقل بالذات مصادر ہیں جب کہ قیاس صرف اس صورت میں قابل قبول ہے جب وہ مذکورہ بالا تین مصادر میں سے ایک پر مبنی ہو۔

مصادر اربعہ میں سے قرآن مجید کی تعریف کرنے کے بعد اس کی نصوص (TEXTS) اور الفاظ و عبارات کی تفسیر و تعبیر کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ تفسیر و تعبیر کے ان اصولوں کے لئے قدیم علمائے اصول نے وجوہ نظم کا اور جدید علمائے اصول نے دلالات کا عنوان اختیار کیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو انگریزی قانون کی اصطلاح میں پر نسپلز آف انٹرپریٹیشن (PRINCIPLES OF INTERPRETATION) کہتے ہیں۔ ان اصولوں میں عام اور خاص، امر و نہی، الفاظ و عبارات کے معانی کے لحاظ سے ان کی قسمیں (مثلاً ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ وغیرہ) شامل ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم علمائے احناف کے ہاں ہے۔ دوسرے ائمہ کے ہاں دوسری اصطلاحات ہیں۔ اصول تعبیر کے ساتھ ساتھ انہی مباحث کے ذیل میں حکم شرعی اور اس کی انواع و اقسام کی بحثیں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ حکم شرعی تکلیفی کی اقسام (مثلاً عزیمت اور رخصت) کے علاوہ حکم شرعی وضعی سے بھی بحث کی گئی ہے۔

سنت کے ذیل میں سنت کی اقسام (مثلاً متواتر، مشہور، خبر واحد) سے بھی بحث کی گئی ہے۔ سنت کی اقسام کے بعد بیان کی اقسام سے بحث ہے۔ یعنی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اور کن کن پہلوؤں سے قرآن کا بیان (یعنی تشریح و توضیح) ہے۔ سنت کے بعد اجماع سے مختصر بحث کی گئی ہے۔ علامہ بزدویؒ کے نزدیک ایک عہد کے مجتہدین کے اجماع کو آنے والے عہد کے مجتہدین منسوخ کر سکتے ہیں۔ قیاس اور اس کی اقسام و اشکال سے بحث نسبتاً زیادہ تفصیل سے کی گئی ہے۔ قیاس ہی کے ذیل میں اجتہاد کی بحث بھی ملتی ہے۔ اجتہاد کے بعد علت (RATIO DECIDENDI) کی بحث ہے جو قیاس کے باب میں سب سے اہم بحث شمار ہوتی ہے۔ کتاب کے آخر میں حکم شرعی سے متعلقہ چند مباحث بالخصوص اہلیت پر گفتگو کی گئی ہے۔

اسلوبِ متکلمین

متکلمین کے اسلوب کے مطابق لکھی جانے والی اکثر کتابیں شافعی اور معتزلی فقہاء کے قلم سے ہیں۔ اگرچہ اس میدان میں مالکی علمائے اصول کی تحریریں بھی ملتی ہیں لیکن ان کا حصہ اس باب میں نسبتاً کم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مالکی فقہ کا رجحان ابتداء میں روایات اور نقل کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے اسلوب میں درایت اور استدلال کا درجہ ثانوی تھا۔ اس لئے ابتدائی صدیوں کے مالکی فقہاء کی دلچسپیاں اس میدان میں کم نظر آتی ہیں۔ بہرحال امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالہ" کے بعد کی تین صدیوں میں اسلوب متکلمین کے مطابق جو کتابیں سامنے آئیں ان میں قابل ذکر کتابیں تین ہیں:

۱۔ علامہ ابوالحسین بصری المعتزلیؒ (م ۴۳۶ھ) کی کتاب المعتمد

۲۔ امام غزالیؒ کے استاد امام الحرمین الجوینیؒ (م ۴۷۸ھ) کی کتاب "البرھان فی اصول الفقه"

۳۔ امام غزالیؒ کی تین کتابوں میں سے ان کی مشہور اور مایہ ناز کتاب "المستصفی من علم الاصول" جس کو طریقہ متکلمین کی بہترین نمائندہ کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان کتابوں کو اصول فقہ کی تاریخ میں بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جن دنوں دنیائے اسلام میں یہ کتابیں لکھی جا رہی تھیں ان دنوں روئے زمین پر دنیا کے کسی گوشہ میں بھی اصول قانون کے مباحث پر اس انداز سے گفتگو نہیں ہو رہی تھی جس انداز کی گفتگوؤں کے نمونے ان کتابوں میں ملتے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں کم از کم آئندہ چار پانچ سو سال تک طریقہ متکلمین پر لکھی جانے والی کوئی کتاب ان تین بنیادی کتابوں سے مستغنی نہیں ہو سکی۔ بعد کی کتابیں اکثر و بیشتر انہی تین کتابوں کی شرحوں، تلخیصوں اور ترتیبات نو سے عبارت ہیں۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) کی مشہور کتاب "المحصول" اور علامہ سیف الدین الآمدیؒ (م ۶۳۱ھ) کی مایہ ناز تالیف "الاحکام فی اصول الاحکام" بنیادی طور پر انہی تینوں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

علامہ جمال الدین اسنویؒ کا کہنا ہے کہ امام رازیؒ کی "المحصول" بڑی حد تک دو کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اس میں بہت کم مباحث ایسی ہیں جو ان دو کتابوں سے نہ لئے گئے ہوں۔ یہ دو کتابیں امام غزالیؒ کی "المستصفی" اور ابو الحسین بصریؒ کی "المعتمد" ہیں۔ علامہ نوویؒ کا بیان ہے کہ امام رازیؒ نے پورے پورے صفحے لفظ بہ لفظ ان دونوں کتابوں سے نقل کئے ہیں۔ اس کی وجہ علامہ اسنویؒ کے نزدیک یہ ہے کہ امام رازیؒ کو یہ دونوں کتابیں زبانی یاد تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی کتاب "المحصول" مرتب کر رہے ہوں گے تو سابقہ کتابوں کی عبارتوں اور الفاظ کا نوک قلم پر آجانا بعید از قیاس نہیں تھا۔

اخذ و استفادہ کے علاوہ امام رازیؒ اور علامہ آمدیؒ کی ان کتابوں سے ایک اور بات کا بھی صاف اندازہ ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ اسلوب متکلمین چھٹی صدی کے اختتام تک اپنی مکمل ترین صورت میں مدون ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ بعد میں آنے والوں نے یا تو اب تک لکھی جانے والی کتابوں ہی کی تلخیص و تشریح و تعلیق پر اکتفا کیا یا پھر طریقہ متکلمین اور طریقہ فقہاء کو جمع کرنے کے کام کو آگے بڑھایا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا طریقہ متکلمین میں سب سے مقبول کتابیں امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور علامہ آمدیؒ ہی کی رہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ امام شافعیؒ کے بعد شافعی اصول فقہ کا بیشتر ارتقاء امام غزالیؒ کی "المستصفی"، امام رازیؒ کی "المحصول" اور علامہ سیف الدینؒ کی "الاحکام فی اصول الاحکام" ہی کے مندرجات کی شرح و تلخیص اور ترتیب نو سے عبارت ہے، امام غزالیؒ اور امام رازیؒ کو اللہ تعالیٰ نے دنیائے اسلام میں جو لازوال اور ضرب المثل شہرت دوام عطا فرمائی اس کے پیش نظر

ایسا ہونا یوں بھی قرین امکان تھا۔ خاص طور پر "المحصول" کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، اس کے کئی اختصارات تیار ہوئے۔ ان میں سب سے مشہور علامہ قاضی ناصر الدین بیضاویؒ (م ۶۸۵ھ) کی "منہاج الوصول الی علم الاصول" ہے جو ایک طرح سے "المحصول" ہی کی تلخیص سمجھی جاتی ہے۔

آئندہ سطور میں ان ابتدائی تین کتابوں کا ذرا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے جو اسلوب متکلمین کی بنیادی کتابیں کہلاتی ہیں اور جنھوں نے بعد کی تحریروں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ ان میں مشہور معتزلی فقیہ ابو الحسین محمد بن علی البصریؒ (م ۴۳۶ھ) کی کتاب "المعتمد" امام الحرمین جوینیؒ کی "البرہان" اور شہرہ آفاق شافعی فقیہ اسلام اور متکلم و مفکر حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی کتاب "المستصفی من علم الاصول" شامل ہیں۔ یہ کتابیں ان چار بنیادی کتابوں میں سے ہیں جن کے بارہ میں مشہور مورخ علامہ ابن خلدونؒ (م ۸۰۸ھ) نے لکھا ہے کہ یہ اصول فقہ کی عمارت کے چار بنیادی ستون ہیں اور اصول فقہ کے کلامی اسلوب کے دور پختگی اور مرحلہ کمال کی بہترین نمائندہ ہیں۔

کتاب "المعتمد فی اصول الفقہ" کے مصنف علامہ ابو الحسین محمد بن علی المعتزلی البصریؒ اپنے زمانہ کے نامور معتزلی مفکرین میں سے تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے مشہور معتزلی متکلم قاضی عبد الجبارؒ کے خاص شاگردوں اور ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ اصول فقہ اور کلام میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے مشہور یہی کتاب "المعتمد" ہی ہوئی جو معتزلہ کے اصولی افکار اور خاص طور پر قاضی عبد الجبار کی تحقیقات کا ایک جامع اور مرتب خلاصہ ہے۔ اصول فقہ کے موضوع پر معتزلی فقہاء کی دوسری تصانیف کی عدم موجودگی میں یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے اور اصول فقہ کی تاریخ میں ایک بڑے خلا کو پر کرتی ہے۔

کتاب کا اسلوب نہایت عالمانہ اور منطقی ہے۔ اس کی بنیاد دراصل مصنف کے استاد علامہ قاضی عبد الجبارؒ کی تصنیف "کتاب العمد" پر ہے۔ مصنف نے "کتاب العمد" کی ایک شرح "شرح العمد" کے نام سے لکھی تھی جس کی تالیف کے دوران ان کو خیال ہوا کہ بہت سے اصولی مباحث ایسے ہیں جن پر وہ "شرح العمد" میں بالکل یا کماحقہ گفتگو نہیں کر سکے۔ پھر بعض جگہ ان کو "کتاب العمد" کی ترتیب اور اس کے مضامین کی نوعیت کے مفید اور مناسب ہونے کے بارہ میں تامل تھا۔ اس لئے انھوں نے "شرح العمد" کی تصنیف سے فارغ ہو کر طے کیا کہ وہ خود ایک مستقل بالذات کتاب اصول فقہ کے موضوع پر لکھیں گے جس میں اپنے تصور کے مطابق مضامین و مباحث کی ترتیب قائم کریں گے اور ان کے استاد قاضی عبد الجبار نے اصول فقہ میں جن مباحث کا اضافہ کیا ہے ان میں سے وہ مباحث نکال دیں گے جو ان کے خیال میں خاص عقلی اور فلسفیانہ نوعیت کے تھے اور جن کا اصول فقہ سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ چنانچہ

قاضی عبدالجبار نے "کتاب العمد" کے آغاز میں فلسفہ علم (EPISTEMOLOGY) کے جن مباحث پر گفتگو کی تھی وہ علامہ ابوالحسین نے کتاب "العتمد" میں شامل نہیں کئے ان کی رائے میں ان مباحث کی اصل جگہ علم کلام ہے نہ کہ اصولِ فقہ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان مباحث کا (جو دراصل مابعد اصول قانون (META-JURISPRUDENCE) کے مباحث ہیں) اصول فقہ کی کتابوں میں بیان کرنا یا تو غیر ضروری تکرار ہے یا سرے سے غیر مفید ہے۔ اگر اصول فقہ کی کتاب کا قاری علم کلام سے واقف ہے تو یہ مسائل اس کے لئے تکرار اور تحصیل حاصل کے مترادف ہیں اور اگر وہ علم کلام سے واقف نہیں ہے تو محض ان ابتدائی اور تمہیدی گفتگوؤں سے وہ ان مباحث کو کماحقہ سمجھ نہیں سکتا' لہٰذا ان کا بیان کرنا اس کے لئے دونوں صورتوں میں غیر ضروری اور غیر مفید ہے۔

علامہ ابوالحسین بصریؒ نے کتاب کے آغاز ہی میں ایک مستقل باب میں اصول فقہ کے ابواب اور مباحث و موضوعات کا ایک عمومی تعارف کرایا ہے اور ان تمام مباحث و موضوعات کے مابین جو ربط پایا جاتا ہے اس کی نشان دہی کی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دلالات کے مباحث (امر و نہی، حقیقت و مجاز، عام و خاص، مجمل و مفصل، ناسخ و منسوخ وغیرہ) کی اہمیت پر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اصول فقہ کا بنیادی مقصد اور ہدف یعنی حکم شرعی کی دریافت کا دارومدار خطاب الٰہی پر ہے اور خطاب الٰہی کی فہم ان مباحث ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ لہٰذا یہ مباحث اصول فقہ میں اولین اہمیت کے حامل ہیں۔ پھر مصادر فقہ کلام الٰہی، کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کا ذکر کیا ہے۔ کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں متواتر اور آحاد کی قسمیں بتائی ہیں۔ اجماع کے بعد قیاس کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ پھر اسالیب استدلال پر بحث کی ہے اور آخر میں مفتی اور مستفتی کی شرائط اور احکام کا ذکر ہے۔ مباحث و موضوعات کی ترتیب کی منطقی وضاحت کا یہ اسلوب مختلف ابواب میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اہم مباحث کے آغاز میں بھی ذیلی مباحث اور ضمنی مسائل کی اسی طرح وضاحت کی گئی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' یہ کتاب معتزلی اصول فقہ کا شاہکار اور بہترین نمونہ ہے۔ لہٰذا فطری طور پر جہاں جہاں معتزلی تصورات عام علمائے اصول کے تصورات سے مختلف ہیں وہاں معتزلی تصورات کو بہت زور شور اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم ایسے مسائل و تصورات کا تعلق اصول فقہ کے اصل مباحث سے کم اور مابعد اصول (META-JURISPRUDENCE) کے مباحث سے زیادہ ہے۔ کتاب کی ایک اور خصوصیت تقابلی مطالعہ ہے۔ مصنف نے بہت سے اہم مسائل میں معتزلی علمائے اصول کے ساتھ حنفی اور شافعی علمائے اصول کے اقوال اور ان کے دلائل بھی اچھی خاصی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مخالفین کے اقوال و دلائل بیان کرنے میں مصنف نے کسی بخل یا تحفظ سے کام نہیں لیا' بلکہ بڑے منصفانہ طریقہ سے اور غیر جانبدارانہ بلکہ حق پرستانہ انداز میں سب کے اقوال و دلائل بیان کئے ہیں۔ دلائل بیان کرنے میں جس جس رائے کے حق میں جو جو ممکن دلائل ہو سکتے ہیں' مثلاً لغوی، عقلی، شرعی وغیرہ

سب نہایت جامعیت سے بیان کرتے جاتے ہیں اور جہاں جہاں وہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ معتزلہ کی رائے کمزور اور ان کے دلائل محل نظر ہیں وہاں حق پسندی سے اس کا اعتراف بھی کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے مسائل میں معتزلہ کی آراء کے بجائے دوسروں کی آراء کو ترجیح دی ہے۔

کتاب "المعتمد" اور اس کے جلیل القدر مصنف کے انہی اوصاف کے بناء پر معتزلہ کے اصولی لٹریچر میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول اور متعارف رہی، اور غیر معتزلی حلقوں میں بھی اس کو یکساں بلکہ نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل رہی، یہاں تک کہ امام رازیؒ جیسے پر جوش اشعری اور نامور شافعی نے اس کو زبانی یاد کیا اور علامہ ابن خلدونؒ جیسے مشہور مالکی فقیہ نے اس کو اصول فقہ کے چار بنیادی ارکان میں سے ایک قرار دیا۔ امام رازیؒ کی کتاب "المحصول فی اصول الفقہ" کے اہم ماخذ میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ واضح رہے کہ امام رازیؒ کی غیر معمولی شخصیت اور دنیائے اسلام میں ان کے اثرات کی وجہ سے ان کی کتاب "المحصول" بہت مقبول ہوئی اور ہر جگہ اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب "المعتمد" کے اثرات بالواسطہ طور پر دنیائے اسلام میں خوب پھیلے۔

دوسری اہم کتاب امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک الجوینیؒ (م ۴۷۸ھ) کی فاضلانہ کتاب "البرھان فی اصول الفقہ" ہے۔ امام الحرمینؒ پانچویں صدی ہجری کے نامور ترین علماء اصول، فقہاء اور متکلمین میں سے تھے بلکہ یہ کہنا شائد بے جا نہ ہوگا کہ پانچویں صدی ہجری میں تاریخ علم اصول کا سب سے نمایاں نام امام الحرمینؒ کا ہی ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے اردو دان قارئین کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہونا چاہئے کہ ان کے تلامذہ میں امام غزالیؒ جیسی شخصیت کا نام بھی شامل ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنی تحریروں میں بڑی عقیدت اور محبت سے امام الحرمینؒ کا ذکر کیا ہے۔

امام الحرمینؒ نے اصول فقہ کے موضوع پر چار کتابیں لکھیں جو چاروں کی چاروں بڑی مقبول اور موثر ثابت ہوئیں۔ یہ چار کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ البرھان فی اصول الفقہ (Very Imp Book)

۲۔ الورقات فی اصول الفقہ

۳۔ التحفہ فی اصول الفقہ

۴۔ التلخیص فی اصول الفقہ

ان چاروں کتابوں میں سب سے زیادہ جامع، مفصل اور مقبول "البرھان فی اصول الفقہ" ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کو علامہ

ابن خلدونؒ نے اصول فقہ کی تین بنیادی کتابوں میں سے ایک قرار دیا تھا۔ یہ کتاب جو دو جلدوں میں ہے عرب دنیا میں کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک وقیع علمی اور مفید ایڈیشن ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب کی فاضلانہ تحقیق کے ساتھ قطر سے ۱۹۸۰ء (مطابق ۱۴۰۰ھ) میں شائع ہوا تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، امام الحرمینؒ ایک ماہر اصولی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بالغ نظر فقیہ اور متکلم بھی تھے۔ اس لیے ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی فقیہانہ وسعت نظر کے ساتھ ساتھ متکلمانہ تعمق کی بھی آئینہ دار ہے۔ کتاب کا آغاز حقیقت علم کی خالص عقلی اور فلسفیانہ بحث سے ہوتا ہے۔ اس بحث سے قبل تمہید کے طور پر وہ حسن اور قبح (یعنی کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ) کے مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور معتزلہ کے اس خیال کی دلائل سے تردید کرتے ہیں کہ چیزوں کے حسن اور قبح کا فیصلہ خالص عقل کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔

حسن اور قبح کا فیصلہ کرنے کے بعد امام الحرمینؒ مسئلہ تکلیف شرعی پر بحث کرتے ہیں اور فقہاء اور متکلمین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد شوافع کی اس رائے کو دہراتے ہیں کہ احکام شرعیہ کا براہ راست مکلف ہر انسان ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ اسلام پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ اس تمہید کے بعد کتاب میں علم، حقیقت علم اور ذرائع و وسائل علم پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اپنی جامعیت اور توازن فکری کے لحاظ سے دنیا بھر کے دینی ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ قدیم علماء اصول کی ترتیب کو اختیار کرتے ہوئے امام الحرمینؒ نے سب سے پہلے اصول تعبیر سے بحث کی ہے۔ یہ حصہ ان کی کتاب کا سب سے بڑا اور مفصل حصہ ہے۔ اس حصے میں جس کے لیے انہوں نے "کتاب البیان" کا عنوان اختیار کیا ہے نصوص کی تعبیر و تشریح کے احکام اور قواعد بیان کئے گئے ہیں اور اس ضمن میں نصوص قرآن کے ساتھ ساتھ سنت قولی اور سنت فعلی پر بھی بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے اس حصے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام صاحب کو عربی لغت اور قدیم عربی ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے جابجا عربی اشعار اور ضرب الامثال سے استدلال کیا ہے۔

کتاب کے بقیہ حصے اجماع، قیاس، استدلال اور ترجیح کے موضوعات پر ہیں۔ یوں یہ کتاب پانچ حصوں یا ذیلی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تیسرا حصہ یا کتاب جو قیاس کے موضوع پر ہے خاصا مفصل ہے اور دوسری جلد کے ڈیڑھ سو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں مصنف نے قیاس کی مشہور قسموں قیاس علت، قیاس شبہ وغیرہ پر بڑی عمیق اور فاضلانہ گفتگو کی ہے۔ بحث کے آغاز میں قیاس شرعی کی حقیقت و ماہیت اور قیاس کے ماخذ قانون ہونے کے دلائل پر انتہائی جامع گفتگو کی ہے۔

قیاس کے باب میں سب سے اہم اور مشکل مسئلہ علّت اور مسالکِ علّت کا ہے۔ یعنی اس بات کا تعین کہ شریعت کے جس حکم کو بنیاد

قرار دے کر اس سے کسی نئے معاملے کا حکم معلوم کیا جا رہا ہے اس میں فیصلہ کی حقیقی بنیاد (RATIO DECIDENDI) کیا ہے اور اس کا تعین کرنے کے لئے کن ذرائع و وسائل اور اعتبارات کو پیش نظر رکھا جائے۔ امام صاحب نے اس کتاب میں ان مشکل اور پیچیدہ مباحث کو جو اکثر و بیشتر خالص عقلی اور فلسفیانہ انداز کے ہیں نہایت آسان اور منطقی انداز میں بیان کیا ہے۔

کتاب کا سب سے مختصر حصہ چہارم ہے جس کے لئے امام صاحب نے "کتاب الاستدلال" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس حصہ یا ذیلی کتاب میں انہوں نے بنیادی طور پر ان مصادر قانون کا ذکر کیا ہے جو عموماً" ثانوی مآخذ کہلاتے ہیں' ان مآخذ میں مصالح مرسلہ 'استحسان' استصحاب وغیرہ شامل ہیں۔ امام الحرمینؒ نے ان مصادر کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد ان میں سے اکثر کو رد کر دیا ہے۔ لیکن رد کرنے کے لئے ان جیسے بالغ نظر محقق اور فقیہ سے جن مفصل دلائل اور عمیق بحث کی توقع تھی ان کو شائد امام صاحب نے غیر ضروری سمجھا۔

کتاب کا آخری حصہ جس کا عنوان "کتاب الترجیح" ہے خاصا مفصل ہے اور کم و بیش ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں امام الحرمینؒ نے مختلف مصادر قانون کے مابین تعارض کی صورت میں کسی ایک ماخذ یا دلیل کو ترجیح دینے کے قواعد و احکام بیان کئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ دونوں حصے یعنی "کتاب الاستدلال" اور "کتاب الترجیح" ایک نئے اسلوب کے حامل ہیں جو علماء اصول کے مروجہ اور مقبول اسلوب سے قدرے مختلف ہے۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب امام الحرمین کے مایہ ناز شاگرد اور تاریخ اسلام کے جلیل القدر فرزند امام ابو حامد محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی کتاب "المستصفٰی من علم الاصول" ہے۔ جیسا کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان جانتا ہے کہ امام غزالیؒ بنیادی طور پر ایک فلسفی، متکلم اور صوفی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف میں فلسفیانہ گہرائی، عقلی اسلوب اور متکلمانہ دلائل کے ساتھ ساتھ ایک صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ یوں تو امام غزالیؒ نے اصول فقہ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں لیکن سب سے زیادہ مقبولیت "المستصفٰی" کو ہی حاصل ہوئی۔ یہ ان چار کتابوں میں سے آخری کتاب ہے جن کو علامہ ابن خلدونؒ نے علم اصول فقہ کے بنیادی ستونوں سے تعبیر کیا ہے۔

اس کتاب میں امام غزالیؒ نے ایک منفرد ترتیب اور ایک دلچسپ اسلوب اختیار کیا ہے۔ انہوں نے علم اصول فقہ کے موضوعات' مباحث اور مقاصد و وسائل کو ایک لطیف تشبیہ کے ذریعے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس پورے علم کو ایک ثمربار درخت سے تشبیہ دی ہے جس کا ایک لگانے والا' ایک پھل کھانے والا' ایک پھل اور پھل حاصل کرنے کا ایک خاص انداز ہے۔ جہاں تک پھل یعنی ثمرہ کا تعلق ہے وہ احکام شریعت ہیں جو ہر ایک کا مقصود ہیں۔ احکام شریعت میں واجب' مندوب' مکروہ اور مباح احکام کے علاوہ عمومی طور پر کسی فعل کے اچھے یا برے ہونے کا معاملہ بھی شامل ہے۔ پھر احکام شریعت میں ادا اور قضاء کے علاوہ صحیح' فاسد اور باطل افعال و اعمال کی گفتگو بھی شامل

Ratio Decidendi - فیصلے کی حقیقی بنیاد

ہے۔ یہ سارے مباحث امام غزالیؒ کے نزدیک علم اصول فقہ کا ثمرہ ہیں جو اس علم کے ہر طالب علم کا اصل مقصود ہیں۔

اس ثمرہ کے لئے بیج فراہم کرنے کا کام وہ ماخذ شریعت انجام دیتے ہیں جن سے کتب اصول میں بحث کی گئی ہے۔ یعنی قرآن مجید، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع امت۔ یہ موضوعات علم اصول فقہ کے بنیادی مباحث کی حیثیت رکھتے ہیں اور کتبِ اصول کا خاصا اہم حصہ ان سے بحث کرتا ہے۔

جہاں تک ثمرہ حاصل کرنے کے طریقوں اور اسالیب کا تعلق ہے تو یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل کے عرب مصنّفین کی تحریروں میں دلالالت کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں اور اسالیب میں تعبیر قانون اور تفسیر نصوص کے وہ سارے قواعد و ضوابط اور اصول و احکام شامل ہیں جن سے کام لے کر قرآن مجید سے نصوص، احادیث مبارکہ اور دوسرے قانونی متون کی تعبیر و تشریح کی جاتی ہے۔ اس مربع کا آخری کونا یعنی پھل حاصل کرنے والا وہ فقیہ مجتہد ہے جو اس پورے عمل سے کام لے کر شریعت کے احکام دریافت کرتا اور لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اس ذیل میں امام غزالیؒ نے اجتہاد کے احکام و شرائط، اس کی قسمیں، مجتہد کے اوصاف اور شرائط وغیرہ سے بحث کی ہے۔ اس طرح علم اصول فقہ مذکورہ بالا چار عناصر پر مشتمل ہے جو گویا علم اصول فقہ کی عمارت کے چار بنیادی ستون ہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنے زمانے کے عام مصنّفین، بالخصوص فلسفہ اور متکلمین کے اسلوب کے مطابق اس امر پر بھی گفتگو کی ہے کہ اصول فقہ کے مباحث ان چار موضوعات تک کیوں محدود ہیں۔

کتاب کا آغاز اصول فقہ کے مقام و مرتبہ پر گفتگو سے ہوتا ہے۔ امام صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ اصول فقہ تمام علوم و فنون میں سب سے اشرف اور سب سے افضل ہے اس لیے کہ وہ بیک وقت عقل و نقل دونوں کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

عقل اور نقل کی اس گفتگو کے بعد امام غزالیؒ ایک مفصل اور بسیط مقدمے میں ان بنیادی عقلی اصولوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے کام لے کر نہ صرف اصول فقہ بلکہ دیگر اسلامی علوم کے سمجھنے اور سمجھانے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ امام صاحب کی یہ بحث ان کی تحریروں میں ایک قابل ذکر مقام رکھتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے امام غزالیؒ نے یونانیوں کی استخراجی منطق کو نہ صرف سراہا بلکہ اس سے اپنی تصنیفات میں بڑا کام لیا اور اس کی مدد سے اسلامی عقائد و تصورات کی تشریح و توضیح اور دفاع کا خوب کام لیا۔ اس تمہیدی گفتگو میں بھی انہوں نے منطق استخراجی کا عطر نکال کر رکھا دیا ہے اور منطق کے وہ اصول انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کردیئے ہیں جن کی، امام صاحب کی رائے میں، اصول فقہ کے ایک طالب علم کو ضرورت پیش آتی ہے۔

منطقی اصولوں کی یہ بحث کتاب کے ابتدائی چالیس صفحات پر محیط ہے اور مصنف کی انتہائی گہری بصیرت اور موضوع پر غیر معمولی

The Greece philosophy has cupressed Ghazali

گرفت کی غماز اور علم منطق پر ان کی قدرت کی آئینہ دار ہے۔ پھر خود یہ کتاب بھی اس موضوع پر امام غزالیؒ کی آخری تصنیف اور ان کے عمر بھر کے مطالعہ، تحقیق، تدریس اور تصنیف و تالیف کا نچوڑ ہے۔ اپنے مضامین کی جامعیت، مصنف کی علمی پختگی، زبان کی سلاست اور اسلوب کی دل آویزی کی یہ کتاب ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اس وقت تک اصول فقہ پر لکھی جانے والی تمام بنیادی اور اہم کتابوں کا نچوڑ ہے بلکہ خود امام غزالیؒ کی اپنی تحقیقات کا بھی نقطہ کمال ہے۔

کتاب کا انداز انتہائی منطقی اور ترتیب نہایت عقلی ہے۔ اس غیر معمولی منطقی انداز اور عقلی ترتیب کے باوجود کتاب میں کہیں بھی خشکی اور پھیکا پن معلوم نہیں ہوتا بلکہ لکھنے والے کی دینی حمیت اور روحانی جذبہ کی جھلکیاں صاف محسوس ہوتی ہیں۔ یوں یہ کتاب بیک وقت اصول فقہ، منطق اور کلام کے ساتھ ساتھ تصوف اور روحانیت کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔

اگرچہ امام غزالیؒ کی وابستگی ہمیشہ فقہ شافعی سے رہی لیکن اس کتاب میں انہوں نے کہیں شافعی نقطہ نظر کو صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ امام شافعیؒ یا کسی اور قدیم شافعی فقیہ سے منسوب ہے۔ انہوں نے ہر رائے اور نظریے کو دلائل کی ترازو میں تولا اور کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا کہ کون سی رائے قابل قبول ہے اور کون سی قابل غور۔ چنانچہ کئی جگہ انہوں نے نہ صرف عام شافعی علمائے اصول کی رائے سے اختلاف کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر خود امام شافعیؒ کے خیالات سے بھی اختلاف کیا۔ بعض مقامات پر انہوں نے شافعی نقطہ نظر کو ترک کر کے احناف کے نقطہ نظر کو قبول کیا ہے اور دلائل سے احناف کے نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔

امام غزالیؒ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک انتہائی مقبول کتاب ثابت ہوئی اور بہت جلد نہ صرف علماء اصول بلکہ عام اہل علم اور درس و تدریس سے وابستہ حضرات نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور یوں یہ اپنے موضوع پر انتہائی اہم اور مقبول کتاب قرار پائی۔ بہت سے اہل علم نے اس کی شرحیں لکھیں اور متعدد اہل علم نے اس کی تلخیصیں تیار کیں۔ امام غزالیؒ کی اس کتاب سے جن لوگوں نے غیر معمولی استفادہ کیا ان میں ان کے نہایت نامور اور جلیل القدر پس رو امام فخر الدین رازیؒ کے ساتھ ساتھ مشہور متکلم علامہ سیف الدین آمدیؒ شامل ہیں۔ امام رازیؒ کی مبسوط اور فاضلانہ تالیف "المحصول" اور علامہ آمدیؒ کی مفصل کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" پر امام غزالیؒ کی "المستصفی" کے اثرات بڑے نمایاں ہیں۔ امام رازیؒ اور علامہ آمدیؒ کی ان دونوں کتابوں کے بہت سے مباحث امام غزالیؒ کی "المستصفی" ہی کی تلخیص معلوم ہوتے ہیں۔

تیسرا اسلوب

جیسا کہ عرض کیا گیا پہلے دونوں اسالیب کو ملا کر ایک تیسرا مخلوط یا مشترک اسلوب بھی جلد ہی وجود میں آ گیا اور تیزی سے مقبول ہوتا

چلا گیا- چنانچہ ساتویں ہجری کے اوائل سے جو کتابیں لکھی گئیں وہ اکثر و بیشتر اسی جامع اسلوب کے مطابق تھیں- اس اسلوب اور اس کے مطابق لکھی جانے والی کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ انھوں نے پہلے دونوں اسلوب کی کتابوں کو (چند کے استثناء کے ساتھ) پیچھے چھوڑ دیا- درسی حلقوں میں اکثر و بیشتر اب انہی نئی کتابوں کو درسی کتابوں کے طور پر اختیار کر لیا گیا' تصنیف و تالیف کے میدان میں یہی کتابیں معیار قرار پائیں اور محققین و مفکرین اصول نے انہی کتابوں اور اسی اسلوب کو اپنی علمی فکری اور تحقیقی کاوشوں کا مرکز بنایا- ذیل میں اس نئے اور جامع اسلوب کے آغاز اور ابتدائی سرگرمیوں کا سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے-

چھٹی صدی ہجری کے دور اصول فقہ میں موضوعاتی توسیع تو نسبتاً کم ہوئی' لیکن تعمق اور گہرائی کے ساتھ ساتھ اس دور میں اصول فقہ میں مزید پختگی اور کمال آ گیا- اسی دور میں علامہ مظفر الدین احمد بن علیؒ حنفی (م ۶۹۴ھ) نے جو ابن الساعاتی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اصول فقہ کی تاریخ میں ایک نئے اسلوب اور رجحان کو جنم دیا- انھوں نے طریقہ احناف اور طریقہ متکلمین دونوں کو یکجا کر کے تیسرا طریقہ متعارف کر دیا- انھوں نے متکلمین کے اسلوب پر مجرد انداز میں اصولی قواعد سے بھی بحث کی اور فقہائے احناف کے اسلوب پر فقہی فروع کو سامنے رکھ کر ان سے اصولوں کا استنباط بھی کیا- یوں انھوں نے ان دونوں اسالیب کے محاسن اور خوبیوں کی حامل کتاب "بدیع النظام" تیار کی جس کا پورا نام "بدیع النظام الجامع بین اصول البزدوی والاحکام" ہے- اس کتاب میں' جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے' مصنف نے "اصول البزدوی اور علامہ آمدیؒ کی "الاحکام" کو سامنے رکھا ہے اور ان دونوں کے محاسن کو سمونے کی کوشش کی ہے- کتاب کے مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے پہلے "الاحکام" کی تلخیص کی اور پھر "اصول البزدوی" سے جابجا ضروری مواد اخذ کر کے مناسب مقامات پر شامل کر دیا-

علامہ ابن الساعاتیؒ کا یہ اسلوب جلد ہی فقہی اور تدریسی حلقوں میں مقبول ہو گیا اور ان کی کتاب کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی- جلد ہی دوسرے اہل علم نے بھی اس کی پیروی شروع کر دی اور پے در پے اس نئے اسلوب پر کتابیں مرتب ہو ہو کر سامنے آنے لگیں- تاہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نئے جامع اسلوب کو احناف کے ہاں زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی اور اس اسلوب پر لکھی ہوئی بیشتر معروف و مقبول کتابیں علمائے احناف ہی کی ہیں-

علمائے احناف کی جس کتاب نے اس اسلوب کو پروان چڑھانے اور مقبول بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا وہ صدر الشریعہ علامہ عبید اللہ بن مسعودؒ (م ۷۴۷ھ) کی "التنقیح" تھی- یہ کتاب اس دور کے عام رجحان کے زیر اثر نہایت مختصر لکھی گئی- کتاب

کو عام فہم بنانے کے لئے خود مصنف ہی نے اس کی ایک شرح "التوضیح" کے نام سے لکھی۔ جلد ہی یہ دونوں کتابیں درسی حلقوں میں مقبول ہو گئیں۔ "التوضیح" کی ایک شرح "التلویح" کے نام سے علامہ سعد الدین تفتازانیؒ (م ۷۹۲ھ) نے تیار کی جو آج بھی بعض قدیم درسگاہوں میں اصول فقہ کی اعلیٰ تعلیم میں درسی کتاب کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ علم اصول فقہ ان قواعد و ضوابط کا نام ہے جن کی مدد سے ایک فقیہ شرعی مصادر سے جزئی احکام کا استنباط کرتا ہے۔

۲۔ عالمی تاریخ میں دنیائے قانون کو پہلی بار اصول قانون عطا کرنے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔

۳۔ علم اصول فقہ کے قواعد و کلیات شریعت اور عقل دونوں کے تقاضوں سے کلی طور پر ہم آہنگ ہیں کیونکہ اس علم کی اساس شریعت الٰہی ہے اور اس کی پوری عمارت عقلی استدلال اور منطقی ترتیب سے استوار کی گئی ہے۔

۴۔ علم اصول فقہ کی غرض و غایت شرعی احکام کے استنباط و استدلال سے آگاہی، انسانی مسائل کے شرعی احکام کی تلاش اور ان پر عمل درآمد، منشائے الٰہی کی خلاف ورزی کے امکان کے سدباب، شبہات سے ایمان کا تحفظ کر کے دین و عقیدہ کے لیے مضبوط عقلی و عملی بنیاد کی فراہمی اور نتیجتہ" دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

۵۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اجتہاد اور قیاس کی تربیت دی تھی۔

۶۔ صحابہ کرامؓ انسانی مسائل کے حل کے لیے اجماع، قیاس، استحسان، استصحاب اور استدلال کے اصولوں پر عمل کیا کرتے تھے۔

۷۔ حضرت عمرؓ کا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام خط ایک ایسی اہم قانونی دستاویز ہے جو دور صحابہؓ میں اصول فقہ کی بنیادوں کی تشکیل کے انداز و رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔

۸۔ امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالہ" اصول فقہ کے موضوع پر اولین قدیم ترین دستیاب باقاعدہ کتاب ہے۔

۹۔ اصول فقہ کے تین نمایاں اسلوب پائے جاتے ہیں:

۱۔ اسلوب فقہاء: اس میں استقرائی انداز اختیار کیا جاتا ہے اور فقہی جزئیات کا مطالعہ کر کے کلیات دریافت کیے جاتے ہیں۔

۲۔ اسلوب متکلمین: یہ اسلوب استخراجی انداز اپنائے ہوئے ہے جس میں اصول وضع کرنے کے بعد ان کی روشنی میں جزئیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۳۔ تیسرا اسلوب مندرجہ بالا دونوں اسالیب کا امتزاج ہے۔

کتب برائے مزید مطالعہ

۱۔ فقہ اسلامی کی نظریہ سازی از ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، مترجم مولانا عتیق احمد قاسمی۔
الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار، لاہور۔

۲۔ جامع الاصول (مقدمہ) از ڈاکٹر احمد حسن، اردو ترجمہ الوجیز فی اصول الفقہ از ڈاکٹر عبدالکریم زیدان۔
مطبع مجتبائی پاکستان ہسپتال روڈ، لاہور۔

3. The Early Development Of Islamic Jurisprudence by Dr Ahmad Hassan
Islamic Research Institute International Islamic University Islamabad.

4. The Emergence Of Islam by Dr Muhammad Hamid Ullah
Islamic Research Institute International Islamic University Islamabad.